ورق ورق زندگی

ایثار کشمیری



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ورق ورق زندگی

ایثار کشمیری

ناشر

کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، جامعہ نگر، دہلی

ISBN: 9789387884519

کتاب کا نام ورق ورق زندگی

نوعیت مضامین

مصنّف ایثار کشمیری

سال ۲۰۱۹ء

تعداد ۵۰۰

قیمت ۳۰۰/روپیہ

ناشر کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، جامعہ نگر، دہلی، موبائل: 9958380431

''اس کتاب کی طباعت کے لیے جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکیڈمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس ضمن میں کلچرل اکیڈمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔''

کتاب ملنے کا پتا:

ایثار پبلکیشنز ترال

فون: 7006541479 / 9419025667

ای میل: isaarkashmiri@gmail.com

انتساب

اُس زندگی کے نام ....
جس کے لوگوں نے مول طے کیے
لیکن وہ نہ بکنے کی قسم کھا کر
انمول ہو گئی۔

رفیق حیات

کی

نذر

جنہوں نے ہمیشہ

میری قلمی کاوشوں کو سراہا

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
۷	دل کی بات	۱
۱۲	زندگی کیا ہے؟	۲
۱۶	زندگی......قسمت کی کہانی	۳
۲۰	زندگی......ایک سربستہ راز	۴
۲۳	زندگی......محبت کی محتاج	۵
۲۹	زندگی......آزمائش در آزمائش	۶
۳۵	زندگی......کشمکشِ عقل و عشق	۷
۴۲	زندگی......تضاد کے پھول	۸
۴۸	زندگی......دل دیکھتا ہے آنکھ نہیں	۹
۵۳	زندگی......رسم ورواج کی ماری	۱۰
۵۷	زندگی......دل لبھانے والا دھوکہ	۱۱
۶۴	زندگی......حادثات کا گلدستہ	۱۲
۷۰	زندگی......ناکامی کے پھول	۱۳

ہلکے سے وقفے کے بعد پروفیسر صاحب نے ہمیں سمجھایا کہ اگر ہم نے کتاب میں چھپی تصویر کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہوتا تو ہم یقیناً جان جاتے کہ وہ ایک تصویر دراصل کئی تصاویر کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے ایک بار پھر ہمیں باری باری وہ تصویر دکھائی۔ میں یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں پڑ گیا کہ اُس ایک تصویر میں ایک انسان، کئی جنگلی جانوروں اور چند پرندوں کی تصویریں بیک وقت موجود تھیں۔ حالانکہ تصویر تو سطحی طور پر دیکھنے سے ایک بڑے سے درخت کی لگتی تھی۔

کائنات کا مشاہدہ بہت ضروری ہے جس کی تاکید قرآن میں بھی ہے۔ لیکن مشاہدات کے ذریعہ تجربہ حاصل کرنا اس بات کے ساتھ جڑا ہے کہ ہم مختصر دورانیہ میں زیادہ سے زیادہ مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ نہیں۔ ہم نے تصویر دیکھی لیکن ہماری نگاہ اس قدر تیز نہیں تھی کہ ہمیں وہ سب کچھ نظر آتا جو اس تصویر میں تھا۔ بغیر غور کیے ہم نے پروفیسر صاحب کے سوال کو غیر اہم سمجھا جبکہ اس سوال کے اندر ہمارے لیے ایک انمول سبق چھپا تھا۔

پروفیسر صاحب کے اس لیکچر نے زندگی کے تئیں میرا رویہ کافی سنجیدہ بنا دیا۔ میں نے اُس دن زندگی کا ایک اہم سبق سیکھ لیا اور وہ یہ کہ مختصر مدت میں زیادہ سے زیادہ زندگی جی لی جائے۔ بجائے اس کے کہ زندگی کے مختلف تجربات کی لمبی فہرست بنانے کے لیے عمر دراز کی دعا کی جائے بہتر یہی ہے کہ مختصر زندگی میں ہی مشاہدات کا احاطہ اتنا وسیع کیا جائے کہ زندگی کا فلسفہ اور کائنات کے معرضِ وجود میں آنے کے اسرار ان مشاہدات کے نرغے میں رہ کر ہمارے لیے ہمہ وقت عیاں رہیں۔ ایک پل میں ایک صدی جی لینا ویسے تو بالکل ناممکن لگتا ہے لیکن یہ انسان ہی ہے جو ایک پل میں ایک نہیں کئی صدیاں جی لیتا ہے۔ اس کے بدولت

اسے زندگی جینے کا جو تجربہ حاصل ہو جاتا ہے وہ اسے زندگی کی کٹھنائیاں آسانیوں میں بدلنے کا ہنر دیتا ہے، اسے دانشمندی کی خلعت پہنا دیتا ہے، اسے معاشرے میں معتبر کر دیتا ہے، اسے فلسفی بناتا ہے اور اسے ایک ممتاز فکر عطا کرتا ہے۔

آپ کے ہاتھوں میں یہ کتاب 'ورق ورق زندگی' میرے ان مشاہدات کا مجموعہ ہے جو میں نے زندگی کو بہت قریب سے جی کے حاصل کیے ہیں۔ میں نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار موت کے قریب جا کر زندگی کی قدر و قیمت جانی ہے۔ لہٰذا زندگی کے تئیں میرا نظریہ ان لوگوں سے مختلف ہونا لازمی ہے جو ایسی رونگھٹے کھڑا کر دینے والی صورت حال سے دوچار نہ ہوئے ہوں۔ ہر انسان زندگی کو اپنے اپنے زاویے سے لیتا ہے اور اسی زاویے کے مطابق اسے جینے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا بھی اپنا ایک زاویہ نگاہ ہے اور میں نے زندگی کو جب اس زاویے سے دیکھا تو یکا یک قلم میرے ہاتھ میں آگیا اور وہ سب کچھ صفحہ قرطاس پر بکھیرنے لگا جو میری سمجھ میں آگیا۔ میری یہ حقیر کاوش آپ جیسے معتبر لوگوں کو کس قدر پسند آجاتی ہے یہ جاننے کا مجھے بے حد تجسس رہے گا۔

میں ان سب لوگوں، جن میں میرے دوست احباب بھی شامل ہیں، کا بے حد ممنوں ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں میں میری ہر ممکن مدد کی۔ میں کشمیر عظمیٰ کے کالم نگار شہزادہ بسمل کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ انہوں نے اپنے زرّیں مشوروں سے نواز کر میرا کام آسان بنا دیا۔ روزنامہ کشمیر عظمیٰ کا بھی میں مشکور ہوں جس میں میرے یہ مضامین چھپتے رہے۔ یہاں میں محترم سلطان الحق شہیدی کا شکریہ کرنا لازمی سمجھتا ہوں جنہوں نے میری اس کتاب کا مسوّدہ پڑھا اور پڑھ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ وہ اس کتاب کے چھپنے کا بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔

ایثار کشمیری

تو کہانی ہی کے پردے میں بھلی لگتی ہے
زندگی تیری حقیقت نہیں دیکھی جاتی

اختر سعید خان

ایک مشت خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

پروین شاکر

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی بدایونی

بات بات میں

''زندگی کی جو روح میرے وجود میں نغمہ سرا ہے وہ تمہاری زندگی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی، لیکن پھر بھی باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے ہماری تنہائی دور ہوگی'' ....

(خلیل جبران)

زندگی کیا ہے......؟

ایک شخص نے لاش سے پوچھا:

''زندگی کیا ہے......؟''

لاش ایک دم کھڑی ہوگئی اور سوال پوچھنے والے کا گلا تب تک دبائے رکھا جب تک کہ اس کی جان نہ نکل گئی۔ اب سوال پوچھنے والے شخص کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ زندگی کیا ہے۔ زندگی سے محروم ہو جانے کے بعد اب وہ بخوبی سمجھ چکا تھا کہ زندگی وہ ہے جو موت نہیں ہے۔ زندگی سانسوں کی روانی ہے، دھڑکتے دل کا شور ہے، رگوں میں دوڑتے خون کا ایک گرم دریا ہے، آنکھوں کی بینائی ہے، کانوں کی قوتِ سماعی ہے، زبان کی قوتِ تکلّم ہے، دماغ کا غور وفکر ہے، ہاتھوں کا کمال ہے اور دماغ کا فلسفہ ہے۔ زندگی زندگی ہے موت نہیں لیکن موت کے بغیر زندگی کا تصور مبہم سا لگتا ہے۔

فی الحقیقت زندگی کا مفہوم ہے پیدائش سے موت تک کی مدّت یا زندہ

وجود یا قوّت یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کا مطلب ہے کسی انسان، جانور یا پودے کی وہ حالت جس میں وہ موجود رہے اور اس کے اعضا اپنے وظائف ادا کرنے کے قابل ہوں یا جس میں وظائف کی ادائیگی مستقل طور پر رک نہ گئی ہو۔ لغت کے اعتبار سے زندگی ایک ایسی چیز ہے جو زندہ مخلوق کو مُردوں سے ممیّز کرے۔اس کا اظہار ایسے ہوتا ہے کہ زندہ مخلوقات بڑھتی ہیں، افزائش نسل کرتی ہیں اور ترغیب دینے پر اپنا ردّ عمل بھی دکھاتی ہیں۔

دیکھا جائے تو زندگی کے لغوی معنی حتمی نہیں کہے جا سکتے ہیں کیونکہ دنیا میں انسانوں کے جتنے بھی علمی اور فلسفی طبقات ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ زندگی کو معنی دیے گئے ہیں۔ایک خدا پرست انسان کے لیے زندگی کا مطلب ہے زہد و تقویٰ کے حصول کے لیے مسلسل عبادت گزاری کرنا۔ ایک فلسفی کے لیے زندگی کا مطلب ہے دنیا کی اصل حقیقت کو کھوج کر ایسے اسرار کو منکشف کرنا جو کہ عام انسان کی سعی اور سوچ سے بالاتر ہیں۔ایک شاعر زندگی کو کسی اور زاویے سے پرکھتا ہے۔اُس کے نزدیک زندگی ایک ایسی غزل ہے جو فن اور معنی کے اعتبار سے کامل ہو اور پڑھنے والے کے ذہن کو دیوانگی کی حد تک جھنجوڑ کر رکھ دے۔ایک استاد کے لیے زندگی کا مقصد معاشرے کی تعمیر کی خاطر دانا لوگوں کی کھیپ تیار کرنا ہے۔ایک سائنس دان کے نزدیک زندگی کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ ہے ارضیات اور فلکیات کی تحقیق میں جٹ کر کوئی نئی دریافت یا ایجاد سامنے لانا۔ایک بچے کے نزدیک زندگی ایک کھلونا ہے جس کے ساتھ کھیلتے کھیلتے وہ بالغ ہو جاتا ہے اور وقت آنے پر اس کا کھلونا ٹوٹ جاتا ہے۔

ایک ماں کے لیے زندگی ایک پُر رونق گھر ہے جس کی چار دیواری کے اندر وہ اپنے بچے کو جنم دیتی ہے اور اُسے دودھ کی صورت اپنا خونِ جگر پلانے کی

لذّت سے سرشار ہو جاتی ہے۔شرابی کے لیے زندگی شراب کی ایک بوتل ہے، یتیم کے لیے اپنے کھوئے ہوئے باپ کا پیار بھرا بوسہ ہے، آدھی بیوہ کے لیے اپنے کھوئے سہاگ کی ایک جھلک ہے، قیدی کے لیے آزاد فضا کی ایک سانس جبکہ یہی زندگی ایک عام انسان کے لیے وہ محنتِ شاقہ ہے جو وہ پیٹ کی بھوک مٹانے کی خاطر دن رات کرتا رہتا ہے۔

ایک سیدھا سادہ انسان لازماً زندگی کے معنی کی اِن پیچیدگیوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے کہ زندگی کیا واقعی اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس کے مختصر اور عام فہم معنی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اصل میں یہ بھی زندگی کا ایک الجھاؤ بھرا زاویہ نگاہ ہے۔ جتنے اذہان، زندگی کے بارے میں اتنے ہی دلائل اور ہر دلیل میں ایک وزن ۔ در حقیقت انسانی نظر اور سوچ کی گیرائی اور گہرائی محدود ہے جس کی بنا پر وہ زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتا ہے بالکل اُن اندھوں کی طرح جو ہاتھی دیکھنے کی ضد کر بیٹھے۔ ہاتھی تو وہ دیکھ نہ سکے البتہ جس اندھے نے ہاتھی کا جو حصہ چھو لیا بس ضد کرنے لگا کہ وہی ہاتھی ہے۔ کسی نے کہا کہ ہاتھی ایک پہاڑ ہے تو کسی نے کہا کہ ایک سانپ ۔ کسی نے کہا کہ تناور پیڑ ہے تو کسی نے کہا کہ اژدھا ہے۔ وہ سبھی اپنی اپنی جگہ صحیح تھے لیکن بینائی سے محروم ہونے کی وجہ سے وہ یہ جاننے سے قاصر رہے کہ ہاتھی دراصل اُن سبھی چیزوں کا جملہ وجود ہے جن کو انہوں نے ایک ایک کر کے محسوس کیا تھا۔

زندگی کے معنی و مطالب کے حوالے سے جو خیالات کی مالائیں پروئی جاتی ہیں اس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ انسان صرف زندہ ہی نہیں بلکہ شعوری طور پر زندہ ہے۔ اُس کے اسی شعور کی بنیاد پر زندگی کے مفہوم کو اس قدر وسعت ملی ہے۔ کمال غور و فکر کے بعد یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کوئی طبعیاتی چیز نہیں ہے

بلکہ ایک ایسی تصوراتی شے ہے جو کہ عام انسان کے دائرۂ سوچ سے باہر ہے۔ زندگی کا مطلب زندگی کو جینا نہیں ہے بلکہ اس کو سمجھنا ہے۔فلسفی کہتے ہیں کہ زندگی دراصل پیدائش اور موت کے بیچ کا وقفہ ہے۔ پھر سے الجھاؤ بھری بات۔ اگر یہی حقیقت ہے تو پیدائش سے پہلے کیا تھا؟ یا پھر موت کے بعد کیا ہوگا؟ یہ واقعی قابل غور باتیں ہیں۔

زندگی مسکراہٹ ہے لیکن اسی مسکراہٹ سے موت کی کھڑکھڑاہٹ جنم لیتی ہے۔بائبل میں لکھا ہے کہ زندگی ایک سایہ ہے۔غور کریں گے تو یہی بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ زندگی عارضی شے ہے کیونکہ کسی چیز کا سایہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتا ہے۔اس طرح انسان کے فانی ہونے کی نوید سنائی جاتی ہے۔گھڑی کی سوئیوں کی ہر ٹک اُس کی زندگی اور موت کے بیچ کا فاصلہ کم کردیتی ہے۔تو پھر زندگی کیا ہے......ایک راز،ایک پہیلی، ایک معجزہ،ایک مخمصہ،ایک آزمائش یہ سب کچھ یا ان میں سے کچھ نہیں۔ زندگی زندگی ہے جسے ہم جی لیتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ یہ فانی ہے اور موت ہمارے تعاقب میں ہے۔ہم جنم لے چکے ہیں لہٰذا یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ پیدائش سے پہلے کیا تھا کسی بھی صورت سے دانائی نہیں ہے البتہ مرنے کے بعد کیا ہوگا یہ جاننا ہمارے لیے لازم بن جاتا ہے۔فی الحقیقت زندگی ایک ایسا مقرر کردہ وقفہ ہے جس میں ہمیں موت کے بعد ملنے والی ابدی زندگی جینے کی تیاری کرنی ہے اور یہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

قسمت کی کہانی

دو ملکوں کی کرکٹ ٹیموں کے بیچ ایک میچ کھیلا جا رہا تھا۔ قطعِ نظر اس کے کہ میچ کس نے جیتا یا کس نے ہارا، دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں نے کروڑوں کے انعامات حاصل کیے۔ جیتنے والی ٹیم کے صرف ایک کھلاڑی نے اکیلے مختلف انعامات کی صورت میں ایک کروڑ روپے سے بھی زیادہ رقم حاصل کی۔ میں یہ میچ اپنے ٹی وی سیٹ پر دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ میرا پانچ سال کا بچہ بھی بڑے انہماک کے ساتھ تقسیم انعامات کی تقریب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ بڑی دیر کے بعد بولا:

"ابو یہ اتنے روپیوں کا کیا کریں گے؟"

سوال تو اس نے سیدھا سا پوچھا مگر میں نے اس کے سوال کو بہت سنجیدگی کے ساتھ لیا۔ میرے ذہن میں فوراً 'قسمت' کی بات آگئی۔ میں نے سوچا کہ اس

کھلاڑی نے محض چار گھنٹے کے تفریحانہ کھیل میں اتنی رقم حاصل کی جس کا کہ ایک عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ زیر زمین کوئلہ کانوں میں کان کنی کرنے والے پسینے سے شرابور مزدوروں کے مقابلے میں تو اس کھلاڑی نے پانچ فی صد بھی محنت نہیں کی مگر اتنی رقم حاصل کی کی کان کنی کرنے والے اُن مزدور کی دس پشتیں مل کر بھی کما نہیں سکتی ہیں۔ میرا دماغ چکرانے لگا کہ اسے کہوں تو کیا کہوں؟ محنت، اُجرت، مقدر یا پھر قسمت۔ پھر سوچنے لگا کہ آخر قسمت کیا ہے؟ قسمت اور تقدیر میں کچھ فرق ہے یا دونوں ایک ہی معنیٰ کے حامل ہیں؟

انسان جب ماں کی اندھیری کوکھ سے جنم لے کر روشن دنیا میں اپنی آنکھیں کھولتا ہے تو وہ اپنے مقدر میں لکھی پونجی بھی ساتھ لے آتا ہے۔ اس کے حصے میں لکھی قسمت کے سہارے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر وہ آہستہ آہستہ اپنی زندگی کے زینے طے کرتا جاتا ہے۔ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے دو اہم چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ دو چیزیں ہیں قسمت اور محنت۔ ظاہر ہے کہ اپنا خون پسینہ بہا کر ایک شخص اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے خوب محنت کی ہے مگر قسمت ایک ایسی چیز ہے جسے انسان محنت کر کے بھی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ دوسری طرف ایک مشہور مقولہ ہے کہ قسمت ہمیشہ بہادروں کا ساتھ دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سخت محنت کا پھل اچھی قسمت کے ساتھ مشروط ہے۔ لیکن جب انسان محنت خوب کرے، اپنا پسینہ بہائے، راتوں کی نیند اپنے اوپر حرام کردے، اپنا سکھ چین سب داؤ پر لگادے غرض جہاں تک اس کی دسترس ہو وہاں تک محنت کے گھوڑے دوڑا دے مگر اسے مطلوبہ چیز حاصل نہ ہو سکے تو پھر کیا کہیے؟ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہمارے گردوپیش میں ایسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو گھر بیٹھے شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں کسی محنت یا مشقت کی تکلیف نہیں اٹھانی

پڑتی ہے۔ایسے لوگ بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو ناز و نعم کے ساتھ پالے جاتے ہیں اور ایسے بد نصیب لوگوں کو بھی ہم دیکھ سکتے ہیں جنہیں زندگی کا ایک ایک دن سوکھی روٹی اور پانی کی چند بوندیں لے کر گزارنا پڑتا ہے۔

زندگی کے کھیل بڑے نرالے ہوتے ہیں۔یہ کہیں بے حساب رحمتیں تو کہیں کلفتوں کی بارشیں برساتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔ایک ہی ملک کی سرزمین پر جنم لینے والے دو انسان لگ الگ حیثیتوں کے مالک بن جاتے ہیں۔کسی کی قسمت یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ایک پر مسرت پل کے لیے عمر بھر ترستا رہتا ہے اور کسی کی قسمت ایسی ہوتی ہے کہ خوشیاں اس کی دہلیز پر پڑی رہتی ہیں۔ایک کربتوں کے صحرا پاٹتا رہتا ہے تو دوسرا راحتوں کے نخلستانی فضاؤں میں مسکن بناتا ہے۔ایک دوسروں کے ٹکڑوں کا محتاج ہوتا ہے تو دوسرا کروڑوں کا مالک۔ایک آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتا ہے تو دوسرا اپنے شکستہ آنگن کی دیوار بھی پھلانگ نہیں سکتا۔ایک علم وحکمت کا خزینہ بن جاتا ہے تو دوسرا جہالت کا پیکر۔کسی پر عزت و توقیر کی دیوی فریفتہ ہو جاتی ہے تو کسی کے گلے گمنامی یا بدنامی کا ہار پڑ جاتا ہے۔کوئی ناکردہ گناہوں کی پاداش میں دار پر چڑھایا جاتا ہے تو کوئی لہو بھرے آستین لے کر بھی بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے۔کوئی سازشوں کا شکار ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف کبھی شک کی کوئی انگلی نہیں اٹھتی ہے۔ایک محنت کر کے چاند پر پہنچ جاتا ہے جب کہ دوسرا محنت کر کے مشکل سے سر چھپانے کے لیے ایک جھونپڑی ہی تعمیر کر پاتا ہے۔ایک اکبر بن جاتا ہے تو دوسرا بہادر شاہ ظفر،ایک مہاتما گاندھی تو دوسرا جواہر لال نہرو،ایک کورو تو دوسرا پانڈو،ایک محمود تو دوسرا ایاز۔ایک سرحد پر دھول چاٹتا ہوا سپاہی بن جاتا ہے تو دوسرا کسی پانچ ستارہ ہوٹل کا مالک۔ایک کرکیٹ بن جاتا ہے تو دوسرا سچن ٹنڈولکر۔

ایک بھگت سنگھ بن جاتا ہے ایک اندرا گاندھی۔ایک رتن ٹاٹا بن جاتا ہے تو دوسرا کسی کارخانے کا چوکیدار۔

یہ واقعی غور طلب ہے کہ قوانینِ فطرت اتنے پیچیدہ کیوں ہیں؟ یہ کیسا راز ہے کہ ایک ہی ماں کے دو بیٹے الگ الگ قسمت پاتے ہیں؟ کیا انسان اپنی بری قسمت پر احتجاج کرسکتا ہے؟ نہیں۔اسے ایسا کرنے کی قطعاً اجازت نہیں۔اُسے اپنی اچھی قسمت پر اپنے خالق کا شکر گزار رہنا ہے اور اپنی بری قسمت پر صبر کرنا ہے۔یہی اس کی استطاعت ہے اور یہی اس کا دینی و اخلاقی فریضہ بھی ہے۔اچھی قسمت بھی امتحان ہے اور بری قسمت بھی آزمائش ہے۔دونوں صورتوں میں ہمیں کھرا اُترنا ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

ایک سر بستہ راز

زندگی کی کتاب کو پڑھنا اور پڑھ کر سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کی عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے۔ہمیں زندگی کی تھوڑی سی معلومات ضرور ہیں مگر زندگی کی حقیقت حقیقتاً ہم جانتے ہی نہیں ہیں۔ ہم غم اور خوشی کا فرق سمجھ لیتے ہیں مگر غم اور خوشی کے اٹوٹ رشتے سے ہم بالکل ناواقف ہیں۔اسی طرح دھوپ اور چھاؤں، سود وزیاں، شام وسحر، بحر وبر، نور وظلمات، خیر وشر، محبت اور نفرت، رقابت و رفاقت وغیرہ جیسی ساری چیزوں کا آپسی والہانہ رشتہ ہماری فہم وفراست سے بالاتر ہے۔ ہم سورج کی روشنی کو دیکھ سکتے ہیں۔اس کی حرارت کو محسوس کر سکتے ہیں مگر سورج کو کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ہم سمندر کی گہرائی اور وسعت کو پاٹ سکتے ہیں مگر اس کی خاموشی کا راز کبھی نہیں پا سکتے ہیں۔اسی طرح ہم زندگی کے مختلف عکس دیکھ سکتے

ہیں یا محسوس کر سکتے ہیں مگر زندگی کو نہیں۔

کوئی انسان، چرند یا پرند جب جنم لے کر اپنی آنکھیں کھولتا ہے تو کائنات کی رعنائی دیکھ کر اسے ایک لمبی عمر کی چاہ ستانے لگتی ہے تا کہ وہ قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز کا لطف اٹھا سکے۔ لیکن دھیرے دھیرے زندگی کا راز اُس کے سامنے کھُلنے لگتا ہے۔ زندگی کے زینے طے کرتے کرتے اس کے خواہشات کے غبارے کی ساری ہوا نکل جاتی ہے۔ تتلی خول سے باہر آ کر دنیا کو تسخیر کرنے کی سوچنے لگتی ہے مگر اگلے ہی پل کوئی بلبل اسے نگل جاتی ہے، بلبل تتلی کو نگل کر خود کو پہلوان سمجھنے لگتی ہے تو بلی اس پر جھپٹ کر اس کی خوش فہمی کو ختم کر دیتی ہے، بلّی بلبل کو چیر پھاڑ کر خود کو شیر سمجھ بیٹھتی ہے تو کتّا اس کو دبوچ کر اس کی میاؤں میاؤں کو خاموش کر دیتا ہے، کتّا بلّی کی جان لے کر خود کو ہاتھی سمجھنے لگتا ہے تو بھیڑیا اس کے وجود کو تار تار کر دیتا ہے، بھیڑیا کتّے کی سانسیں روک کر خود کو شیر سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتا ہے تو شیر ببر اپنے جبڑے میں اس کا حلق پکڑ کر اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیتا ہے، شیر بھیڑیے کو اپنے پنجوں میں بے حس و حرکت دیکھ کر خود کو نا قابل تسخیر سمجھنے لگتا ہے تو وہ انسان کی دماغی صلاحیتوں کا شکار ہو کر اپنی بادشاہت کو ختم ہوتے دیکھتا ہے، انسان شیر کی لاش پر چڑھ کر اپنا سینہ تاننے لگتا ہے کہ ملک الموت اس کی روح قبض کر کے اسے خاک بنا دیتا ہے۔

متذکرہ بالا حقائق کے باوجود دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو زندگی کا راز پا کر اسے سوچ سمجھ کر جی لیتے ہیں۔ انہیں زندگی کے اتار و چڑھاؤ کا اچھی طرح سے علم ہوتا ہے۔ وہ زندگی کا دروں اور فسوں کھلی آنکھ سے اس طرح دیکھ پاتے ہیں جس طرح ہم اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہی لوگ ایک لمحے میں صدیاں جی لیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جینے سے پہلے مرنا سیکھ لیتے ہیں اور جشن منانے

سے پہلے غموں کے ساتھ رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔

ہم بھی اگر ایک کامیاب زندگی جینا چاہتے ہیں تو ہمیں زندگی کا وہ پہلو جاننے کی کوشش کرنی ہے جو اس کی اصل حقیقت ہے۔یعنی وہ حقیقت جو انسان کو کرۂ ارض پر بسانے کا موجب بنی۔اس کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کے ساتھ رشتۂ محبت جوڑا جائے۔ہمیں خود کو پہچاننا ہوگا، اپنے خالق و پالنہار کو پہچاننا ہوگا۔ہمیں زندگی کو محض کھانے پینے،سونے جاگنے، ہنسنے رونے، جیت یا ہار، یا عیش کوشی کا نام نہیں دینا چاہیے۔

......☆☆......

زندگی......!

محبت کی محتاج

محبت کیا ہے؟ محبت کا مطلب ہے کسی دوسرے کے لیے گرم جوشی، جذباتی لگاؤ، ذاتی وابستگی کا احساس یا کسی کے متعلق شدید جھکاؤ، رغبت یا پسندیدگی۔ دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو محبت ایک ایسا کچّا دھاگا ہے جو دو کناروں کے بیچ جتنا کس کے باندھا جائے اتنا ہی سخت اور مضبوط بن جاتا ہے۔ محبت کا یہی کچّا دھاگا معجزے دکھاتا ہے۔ ہماری زندگی کو رنگ و بو سے لبریز گلدستہ بنا دیتا ہے۔ انسانی دلوں کے بیچ ایسا حلاوت بھرا رشتہ قائم کر لیتا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ ایک معاشرے میں کتنے دل دھڑکتے ہیں اور اگر سب کے سب دل اس کچّے دھاگے سے ایک دوسرے کے ساتھ کس کے جڑے رہیں تو معاشرہ کتنا مثالی بن جائے گا۔ کچّے دھاگوں کا محبت کا بُنا ہوا جال جس معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا وہاں نفرت کی کوئی دیوار

نہیں اٹھ سکتی ہے۔محبت حیاتِ انسانی کی روح ہے۔جسم سے اگر روح نکل جائے تو بس خاک کا ایک پُتلا رہ جاتا ہے۔پھر ایک انسان یہ کیسے سہہ سکتا ہے کہ اس کی زندگی محبت کی خشک سالی کی وجہ سے خاک ہو جائے۔

محبت جاننے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ایک یہ کہ محبت لے کے اور محبت دے کے اس کی رسیلی لذّت محسوس کر کے اس کے معنیٰ و مطالب سمجھے جا سکتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں کا حال جاننے کی کوشش کی جائے جو نفرت و کدورت کے جھلسا دینے والے صحرا سے گزر رہے ہوں۔ایسے لوگوں سے مل کے ہم یہ راز پالیں گے کہ اس کربناک حالت سے جو چیز ان کو نجات دلا سکتی ہے وہ ہے 'محبت'، یعنی نفرت کی ضد۔

خداوند کریم نے انسان کو روئے زمین پر بسانے سے پہلے کائنات کو بے شمار نعمتوں سے مالا مال کیا تا کہ اس کی زندگی کا سفر آرام سے کٹ سکے۔ہوا، پانی، آگ، پہاڑ، وادیاں، کھیت، کھلیان، حیوانات و نباتات غرض ان گنت فائدہ بخش چیزیں اپنے بندے کی راحت رسانی کے لیے معرض وجود میں لائیں۔اس طرح پہلی محبت خدا نے اپنے بندے کے ساتھ کی ہے۔بعد ازیں انسان نے اپنی معاشرتی زندگی کا آغاز اپنی ماں کی کوکھ سے کیا۔یہی وہ جگہ ہے جہاں محبت کا پہلا درس ملتا ہے۔انسانیت کو محبت کی لڑی میں پرونے کا کام یہیں سے شروع ہو جاتا ہے اور اس محبت کو ہم 'ممتا' بولتے ہیں۔یہ ممتا یعنی ماں کی بے لوث محبت ساری محبتوں کا سرچشمہ ہے۔ماں کی ممتا، میاں بیوی کا آپسی رشتہ، والدین کی اولاد کے تئیں والہانہ وابستگی، بھائی بہن کا اٹوٹ رشتہ، دادا دادی یا نانا نانی کا اپنا پن، موسیوں کا لاڈ پیار، خالاؤں کی جنونی محبت، چاچاؤں کی نگہداشت، ماموؤں کی اُلفت وغیرہ وغیرہ یہ سارے محبت کے الگ الگ نام ہیں۔ہماری زندگی لمحہ بھر

کے تامل کے بغیر رواں دواں ہے بالکل اس گاڑی کی طرح جوتب تک نہیں رکتی ہے جب تک کہ منزل مقصود پر نہ پہنچے۔ ہماری زندگی کی اس گاڑی کا ایندھن محبت ہے جس کے بغیر یہ ایک قدم بھی چل نہیں سکتی۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ جس گھر کا ماحول والہانہ ہوتا ہے اور جہاں کے شب وروز پیار کی چاشنی میں گزرتے ہیں اس گھر میں پلے بڑھے افراد معاشرے کے لیے سرمایہ افتخار ہوتے ہیں۔ وہ سماجی ڈھانچے کو استوار رکھنے میں ایک نمایاں کردار نبھاتے ہیں۔ واضح طور پر اس لیے کہ ان کی سوچ وفکر میں گیرائی، گہرائی اور اونچائی ہوتی ہے کوئی بگاڑ، فساد یا تضاد نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس پُرفتن ماحول میں پروان چڑھے افراد بگڑے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ معاشرتی بگاڑ کی وجہ بھی بن جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ محبت ہی ایسی چیز ہے جو زندگی کے بحرِ بے کراں میں سکون اور ٹھہراؤ قائم کرسکتی ہے ورنہ زندگی کے طوفانی مد و جزر ہمارے سفینۂ حیات کو طرح طرح کے گردابوں میں ڈال کر ہمیں منزلِ مقصود سے دور رکھیں گے۔

جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو محبت کی بے شمار داستانیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ داستانیں جنہوں نے انسانی زندگی کو وقت وقت پر ایک نئی جہت بخشی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کو حُبِّ الٰہی غارِ حرا میں کھینچ لائی نتیجتاً بنی نوع انسان کو رشد و ہدایت کا خزینہ مل گیا۔ خود خداوند کریم کو محمد ﷺ کی محبت نے اسے عرش عظیم تک لانے پر اکسایا۔ حضرت موسیٰؑ کو عشق الٰہی کوہِ طور پر لایا حالانکہ اس کو لَن ترانی کی صدائیں بھی آ گئیں مگر ایک محبّ اپنے محبوب کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹے کی محبت میں اپنی آنکھوں کا نور کھو دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خالق کائنات کی محبت میں خود اپنے لخت جگر کے حلق پر چھری چلا دی۔ اس طرح ایک کے بعد ایک اپنے بندوں کی عقیدت بھری محبت کو

دیکھ کر اور پرکھ کر خداوند کریم کا دریاء رحمت جوش میں آ گیا اور ارشاد ھوا۔ رضی الله عنهم و رضوا عنه۔

آج کل جو فسادات کی بھرمار ہے، قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے، جبر و استبداد کی داستانیں رقم کی جارہی ہیں، عدل و انصاف کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں، انسانیت کے پرخچے اُڑ رہے ہیں اور انسانی لہو سے انسان اپنی پیاس بجھاتا ہے یہ سب آپسی محبت اور بھائی چارے کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ جب انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو وہ اس کی ساری خطا کاریوں کو تہہ دل سے معاف کرتا ہے۔ محبت میں ذرا سی کمی آتے ہی سامنے والے کی وہ خامیاں ہمارے سامنے ابھر کر نمایاں ہو جاتی ہیں جو ورنہ محبت کے لچھے دار پردوں میں چھپ جاتی ہیں۔

ماں اپنے بچوں سے محبت کرتی ہے اور اسی لیے وہ ان کی بڑی سے بڑی غلطیوں کو ہمیشہ صرف نظر کر کے پس پشت ڈالتی ہے اور بچے کے تئیں اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔ نہ معلوم کیوں، ہم ہمیشہ یہ آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ ہم غلطیاں کریں اور دوسرے ہمیں بس معاف کرتے جائیں اور ہم اگر کوئی خطا کریں تو کوئی پرسش نہ ہو؟ ہم کیوں یہ امید رکھتے ہیں کہ ہمیں نفرت کے بدلے میں محبت ملے گی؟ یہ تو محبت کی سرشاری ہے جو انسانی دل کے اندر دوسروں کی زیادتیوں کو سہہ لینے کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔

چنانچہ ہمارے وجود میں یہ عادت رچی بسی ہے کہ ہم اپنے سینوں کے اندر نفرت کے ہی بیج بوتے رہتے ہیں لہٰذا ہر طرف نفرت و کدورت کی جھلسا دینے والی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ مختلف قوموں کے اندر مذہبی، نسلی، علاقائی، لسانی یا جنسی بنیادوں پر مخاصمت سب اسی حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ آج کا انسان، دولت و ثروت، سائنس و ٹیکنالوجی، شہرت و عظمت، علم و حکمت، شجاعت و بہادری، جیسی

خوبیوں کا مالک ضرور ہے مگر افسوس کہ محبت جیسی عظیم دولت سے اس کا دل خالی ہے۔محبت کے بغیر زندگی اُس شاندار محل خانے کی مانند ہے جس میں روشن قمقمے نہ ہوں۔ایسے باغ کی طرح ہے جس کے چمنستانوں میں مسکراتے لبوں کی چٹکتی کلیاں نہ ہوں۔اس دریا کی طرح ہے جس میں لطیف احساسات کی روانی نہ ہو۔وہ حسین و سرسبز وادی ہے جس میں امن و آشتی کی کوئی کوئل کوکتی نہیں ہو،ایک ایسی شاہراہ ہے جو ہر پل سنسان رہتی ہو،ایک ایسا ہرا بھرا جنگل ہے جس میں اُچھلتے ہرن نہ ہوں، ایک ایسی بل کھاتی ندی ہے جس میں کوئی ترنم نہ ہو،ایک ایسی محفل ہے جس میں کوئی شمع روشن نہ ہو،ایک ایسا نغمہ ہے جس میں کوئی سُر یا تال نہ ہو......

یہ ہماری اپنی دسترس میں ہے کہ آیا ہم اپنے سینوں کو محبت کی حلاوت سے بھر کر زندگی کو ایک مہکتا گلشن بنا دیں یا پھر نفرت کے کانٹے بو کر اپنی زندگی کو بھی اجیرن بنا دیں اور دوسروں کے لیے بھی دردسر پیدا کریں۔مشہور کہاوت ہے کہ محبت کے بدلے محبت ملتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح گندم بو کے گندم ہی اُگتی ہے ببول نہیں۔بس یہی تو اصل راز ہے۔ہم بھی اگر کسی تأمل کے بغیر محبت بانٹنا شروع کردیں تو لازماً وہ وقت آئے گا جب چہارسو محبت کی بہار ہوگی۔تب ہر کسی کو جینے پر ناز ہوگا۔پیار و محبت کے رنگ و بو سے سارا ماحول لبریز ہو جائے گا۔جینے میں ایک رسیلا پن محسوس ہو جائے گا۔نفرت ،بغض ،حسد اور عداوت کی اونچی دیواریں چشم زدن زمین بوس ہو جائیں گی اور پھر اونچ نیچ کی تفریق، حاکم و محکوم کا فرق،مرد و زن کی تمیز،اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز......یہ سب باتیں بے معنی بن جائیں گی تو بس پھر کیا......بغض و عناد کی آندھی میں محبتوں کے چراغ جلانا ہی دانش مندی ہے۔ایسا کرنے سے نفرت کا اندھیرا بھاگ جائے گا اور ذرہ ذرہ کائنات کا جگمگ چمک اٹھے گا۔اعتماد کی نئی دنیا آباد ہو جائے گی۔پھر آندھی چلنے کا ڈر ہوگا اور نہ

نشیمن لٹنے کا خوف۔ کسی بلبل کے چہکنے پر پہرے ہوں گے اور نہ غنچوں کو مسکرانے کی قید۔ کوئی صیاد ہوگا اور نہ کوئی بسمل۔ ہر طرف محفلیں سجیں گی، محبت بٹے گی، چاشنی پھیلے گی اور نفرت سے مکدر فضا ایک دم مہک اٹھے گی پیار و محبت کی بھینی بھینی خوشبو سے۔ ایک آسمان ہوگا اور ایک زمین ہوگی۔ لاکھوں کروڑوں ہوں گے آدم زاد مگر ایک وحدانیت ہوگی ہر کسی کی سوچ و فکر میں جو ضامن بن جائے گی ہماری اور ہماری آنے والی نسلوں کی......

......☆☆......

زندگی...!

آزمائش در آزمائش

آزمائش اور سزا انسانی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں۔ چناچہ ہمارے لیے یہ بھی ایک آزمائش ہے کہ ہم آزمائش اور سزا میں فرق کر سکیں۔ سزا گناہوں، خطاؤں مکر وفریب یا ظلم جیسی حرکات کا کفارہ ہے۔ مگر جب ہم آزمائش کی بات کرتے ہیں تو عاشق و معشوق، محبّ و محبوب، آقا و غلام یا پھر خدا اور بندے کا وہ نازک رشتہ ذہن کو ٹٹولتا ہے جو بار بار آزمانے سے پتھر کی طرح سخت اور مضبوط بن جاتا ہے۔ ایک عام انسان سے لے کر پیغمبروں تک بلا لحاظ عمر و جنس ہر کوئی طرح طرح کی آزمائشوں سے دو چار ہوا ہے۔ البتہ آزمائشوں کے معیار میں ہمیشہ ایک واضع فرق رہا ہے۔ پیغمبروں کی آزمائشیں اتنی سخت اور جانگداز ہوا کرتی تھیں کی ان کا تصور کرتے ہی انسان لرز اٹھتا ہے مگر صاحب ایمان لوگ آزمائشوں کو ہمیشہ خوشی خوشی گلے لگاتے رہتے ہیں۔ شیطان اور اس کے چیلوں کے چہروں سے رنگ

اڑ جاتا ہے اور ان کے حربے اور چالبازیاں سب خاک میں مل جاتی ہیں جب آزمائش سہنے والے دیوانے سہم جانے کے برعکس کچھ زیادہ ہی نکھر جاتے ہیں، ان کی جمود بھری زندگی ایک دم سے تھرک اٹھتی ہے اور ان کی ٹھہری طبیعتوں میں روانی سی آجاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہر محبت آزمائش سے پرکھی جاتی ہے، وفاداری کا ہر دعویٰ زندگی کی امتحان گاہ میں ثابت کرنا پڑتا ہے، حب الوطنی کا جذبہ دل میں پالنا ہی کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ میدان عمل میں جان کا نذرانہ دے کر اسے سچ ثابت کرنا ہوتا ہے۔

جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو آزمائشوں کی لمبی داستانیں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔حضرت آدم کو خلد میں آزمایا گیا، حضرت یعقوبؑ کو اپنے چہیتے بیٹے یوسفؑ کی جدائی میں آزمایا گیا، حضرت ابراہیمؑ کو دہکتی آگ میں اور اپنے لخت جگر اسمٰعیلؑ کی قربانی پر آزمایا گیا اور حضور پر نور ﷺ کو بازارِ طائف اور شعب ابی طالب میں آزمایا گیا۔ ایسی کتنی ہی آزمائشیں حضور پر نور ﷺ کی حیات مبارکہ کا ایک ایسا حصہ رہی ہیں جن کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکی۔ مثلاً حضور ﷺ چاہتے تھے کہ مکہ کے مشرک و کفار ان کی دعوت پر بغیر کسی مزاحمت کے لبیک کہیں مگر ایسا نہیں ہوا؟ وہ اپنا وطن چھوڑنا نہیں چاہتے تھے مگر تپتے ریگزاروں کو عبور کر کے انہیں مدینہ جانا ہی پڑا۔ وہ امن کے پیامبر تھے مگر انہیں تلوار سونت کر میدانِ جنگ میں آنا ہی پڑا۔ وہ میدان احد میں پچھڑنا نہیں چاہتے تھے مگر آزمائش دیکھیے کہ جیتی ہوئی جنگ ہار بیٹھے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر یہ آزمائشیں کیوں؟ پیغمبر اور رسول تو اللہ کے بہت قریب ہوتے ہیں پھر خدا کو یہ کیوں پسند ہوا کہ ان کو آلام و مصائب سے دوچار کر دیا۔ وہ اس لیے کہ عزیمت کے راستے پر چلنے والوں کا آزمائشوں کے ساتھ نبرد آزما ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدائی دربار سے

دھتکارے نہیں گئے ہیں۔ انہیں رد نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ قرب الٰہی سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ یہ اسی قربت کا نتیجہ ہے کہ خدا بار بار اپنے چہیتے بندوں کے ایمان واعتقاد کو پرکھتا رہتا ہے۔

اپنی روزمرہ زندگی میں بحیثیت ایک عام انسان ہمیں بھی طرح طرح کی آزمائشیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ سنجیدہ فطرت لوگوں کے لیے تو آزمائش بھری زندگی ایک انمول سوغات ہوتی ہے۔ آزمائشیں ان کے لیے برستی برکھا کی مانند ہیں جو اُن کی ویران زندگیوں میں تازگی اور شادابی پیدا کر دیتی ہیں۔ ہمیں اس پاک پروردگار کا کتنا مشکور وممنون رہنا چاہیے کہ ہمیں اس آزمائش میں نہیں ڈالا کہ ہم کسی سلطنت کے بادشاہ ہوتے۔ یہ رحم بھی ہم پر کیا کہ انصاف کا ترازو ہمارے ہاتھوں میں نہیں دیا۔ کیا ہم پر یہ اوپر والے کا کرم نہیں ہے کہ اس بے رحم دور میں زمام اقتدار ہمارے ہاتھوں میں نہیں تھما دی کیونکہ یہ وہ ہمالیائی آزمائشیں ہیں جن کے سامنے سرخرو ہونا ہم جیسے کمزور ایمان والوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ جب حضرت عمرؓ کو منصب خلافت پر تعینات کیا گیا تو ان پر غشی طاری ہوگئی۔ وہ تنہائیوں میں رب کائنات سے گرگڑا کر یہ التجا کیا کرتے تھے کہ مولیٰ ملک وقوم کی خدمت کا بار مجھ سے اٹھایا نہیں جا سکے گا۔ چھوٹی چھوٹی آزمائشوں سے لرز اٹھتا ہوں۔ اتنی بڑی آزمائش میں کیسے کھرا اتر پاؤں گا اگر تمہارا کرم شامل حال نہ رہا۔ تو واضح ہے کہ جتنا بڑا رتبہ یا عہدہ اتنی ہی بڑی آزمائش۔ ہم جیسے سیدھے سادے لوگوں کو اگرچہ بڑی بڑی آزمائشوں سے جوجھنا نہیں پڑتا ہے مگر اپنی سطح پر ہم بھی آزمائشوں کے ایک بڑے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اکثر آزمائشیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم شاید آزمائش کے طور لیتے ہی نہیں ہیں۔ مثلاً ہمارے ہمسایہ کے پاس قیمتی گاڑی ہے، عالیشان بنگلہ ہے، رہن سہن کا

اعلیٰ معیار ہے، نوکر چاکر ہیں۔ غرض یہ کہ زندگی کی ہر خوشی اس کی غلام ہے۔ جب کہ ہمارے گھروں میں پیسوں کی ریل پیل کم ہوتی ہے، گاڑی کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے، بنگلہ کیا بس ایک چھوٹا سا گھر ہوتا ہے۔ خود ہی خود کے مالک ہوتے ہیں اور خود ہی خود کے نوکر۔ یہاں ہمارے ایمان کی آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔ ہم اکثر سوچنے لگتے ہیں کہ ہمارے ہمسایہ کے پاس جو کچھ بھی ہے ہمارے پاس بھی ہونا ہی ہونا چاہیے۔ آزمائش...... ہمارا ہمسایہ بھلے ہی ناز و نعم کی زندگی گزارتا ہو مگر اس سے ہمارے ایمان پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ یہی آزمائش ہے اور یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ دولتمندوں اور عیش کوشوں کی زندگیوں میں مصنوعی خوشی ہوتی ہے مگر وہ ہمیشہ سکوں کے ایک پل کو ترستے رہتے ہیں۔

اہل ثروت لوگوں کے لیے یہ آزمائش ہے کہ ان کے ذرائع آمدن قانونی اور اخلاقی طور کس حد تک جائز ہیں۔ دھن دولت کا مالک ہوتے ہوئے انہوں نے کس حد تک غربا، مساکین اور ہمسایوں کا خیال رکھا اور ہم جیسے متوسط لوگوں کے لیے یہ کڑی آزمائش ہے کہ دوسروں کی عیش کوشی دیکھ کر کہیں ہمارا من بھی للچاتا تو نہیں ہے۔ ہمارا ایمان متزلزل تو نہیں ہو رہا ہے۔ کہیں ہم اپنی قسمت سے نالاں تو نہیں ہیں۔ 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' ہمارے نفس کی ترجمانی تو نہیں کرتا۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب شیطانی ارادوں پر پانی پھیر کر ہمیں خود کو سرخرو کرنا ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں آزمائشوں سے ہمکنار ہو کر ہم تیز بہاؤ والے نالے میں لُڑھکتے پتھر کی طرح گھس گھس کر اپنے اندر طوفانوں سے الجھنے کا مادہ پیدا کر لیتے ہیں جو ہماری فلاح کا ضامن بن جاتا ہے۔

ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم دھوپ چاہتے ہوں اور بارش برسے اور جب بارشوں کی تمنا کریں تو جھلسا دینے والی دھوپ جھیلنی پڑے۔ ہمارے لیے

آزمائش یہ ہے کہ ہم خوشیوں کے طالب ہوں مگر غموں سے ہمکنار ہو جائیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم اولادِ نرینہ کے خواستگار ہوں اور اوپر والا ایک کے بعد ایک بیٹی ہماری جھولی میں ڈالدے۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ کامیابی کی تمنا کریں اور ناکامی ہاتھ لگے۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم مسکرانا چاہتے ہوں مگر بہانے کو فقط اشک ملیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم نخلستانوں کی آرزو کریں مگر سراب پاٹنے پڑیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم معاشرے میں عزت و تکریم چاہتے ہوں مگر الٹا ہم سازشوں کا شکار ہو جائیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم بھیڑ چال نہ چلیں بلکہ وہ راستہ چن لیں جو آخرت کی کامیابی کا ضامن ہو۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم اصولوں کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہ کریں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ایمان و وفا کی شمع اس وقت روشن کریں جب الحاد کی آندھی چل رہی ہو۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم ظالم بادشاہ کے سامنے حق گو بن جائیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم اس وقت اپنے ہوش و حواس قائم رکھیں جب سارے لوگ پاگلوں کی طرح ہمارے پیچھے پڑے ہوں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم اپنے کسی بھائی کو آزمائش میں نہ ڈالیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم مال حرام کے خزانے کھلے دیکھ کر حرص کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہمارے قرب و جوار میں کوئی یتیم آہ نہ بھرے۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ مادیت کے میکدوں کی ہاؤ ہوس کر کہیں ہم بھی بہک نہ جائیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم نفرت کے انگاروں کو محبت کی برکھا سے ٹھنڈا کریں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ ہم اپنے بوڑھے والدین کی تند مزاجی کو صبر و تحمل سے جھیلیں۔ ہمارے لیے آزمائش یہ ہے کہ سماجی برائیوں کے تئیں نہ صرف یہ کہ ہم

اظہار نفرت کریں بلکہ ان کا قلع قمع کرنے کی خاطر منظّم کوشش بھی کریں ......

عفو خدایا! زندگی کا کونسا پڑاؤ ہے جہاں ہمیں امتحان نہیں دینا پڑتا ہے۔ اور پھر ہمارے لیے سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ ابلیس دھن دھناتا ہوا آزاد گھوم پھر رہا ہے جو ہمیں زندگی کے ہر دوراہے پر عجیب قسم کے وسوسوں میں ڈال دیتا ہے، جو ہماری ایمان کی پونجی کو لوٹنا چاہتا ہے، جو ہمیں دنیاوی لذّتوں سے آشنا کر کے دین سے دور رکھنا چاہتا ہے، جو کبھی ہمارے دلوں میں دشمن کا خوف ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی عیش کوشی کی مے پلانا چاہتا ہے، جو ہمیں آرام و آسائش کے ایسے دلفریب مناظر سے روبرو کراتا ہے جن میں ہماری تباہی چھپی ہوتی ہے، جو ہمارے اندر مزاج خانقاہی پیدا کر کے ہمیں میدان عمل سے کوسوں دور لے جانا چاہتا ہے، جو ہمیں درویشی اور قلندری کے گر سکھا کر دین کی اصل روح سے غافل رکھنا چاہتا ہے۔ مگر آزمائشیں ہی ہمیں زندگی کے معانی و مطالب سمجھاتی ہیں۔ جَو چکی میں پس کر ہی آٹا بن جاتا ہے۔ لہٰذا زندگی سہل انگاری کا نام نہیں ہے بلکہ پیہم کشمکش کا نام ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

......☆☆☆......

زندگی......!

کشمکشِ عقل وعشق

جب آدمی نے روئے زمین پر اپنا رہن سہن شروع کیا تو اس نے اپنے اردگرد کے جغرافیائی اور معاشی حالات میں خود کو سمانے کی کوششیں بھی شروع کیں۔ ایسا کرنے کے لیے اس نے عقل کا خوب استعمال کیا۔ عقل ہی آدم زاد کی ایک ایسی صفت ہے جو اسے دیگر مخلوق سے ممیّز کرتی ہے۔

عقل کیا ہے؟ عقل فہم، دانائی، شعور، تمیز، سمجھ، ادراک اور نفسِ ناطقہ کا نام ہے۔ انسان جب بے سروسامانی کے عالم میں تھا تو عقل اس کے کام آگئی۔ عقل نے اسے مختلف خطرات سے بچنے کی تدابیر سکھائیں مثلاً سردی کی شدت یا گرمی کی تپش کا مقابلہ کرنے کے طور طریقے سکھائے۔ قدرتی آفات کا مقابلہ کرنا سکھایا۔ بھوک اور پیاس مٹانے کے گر سکھائے۔ اپنے بچوں کی پرداخت کرنے کے انداز بتلائے۔ اچھا اور برا، نیکی اور بدی، خوشی اور غم، راحت اور رنج یا حیات

اور ممات جیسے احساسات کا ادراک کرایا۔ یوں عقل کے سہارے انسان ترقی اور خوشحالی کے زینے طے کرتا گیا۔ مگر انسانیت کے اس لمبے سفر کے دوران انسان کو کئی بار ایسے حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا جہاں اس کی عقل فیل ہوگئی۔ تب اس کے اندر کے وجود سے کوئی دوسری چیز وجود پذیر ہوئی جس نے اس کا کام آسان بنا دیا اور وہ تھی 'عشق'۔ یہاں سے شروع ہوگئی عقل اور عشق کی جنگ۔ عقل جہاں انسان کو کوئی کام کرنے کی صلاح دینے لگتی ہے تو عشق روڑے اٹکاتا ہے اور جہاں عشق انسان کو آگے بڑھنے پر اکساتا ہے وہاں عقل انسان کو پیش و پس کے گرداب میں ڈال دیتی ہے۔ زندگی کے شب و روز آسانی سے گزار لینا ویسے بھی ایک خام خیالی ہے کیونکہ زندگی کے ہر موڑ پر مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے ہوتے ہیں جنہیں سر کرنا عقل کے اعتبار سے ناممکن ہے مگر عشق ان کو ایک جست میں پھلانگ کر پار جا کر ڈیرا ڈال دیتا ہے۔

عقل پشیمان ہو جاتی ہے۔ عشق کے ہاتھوں بار بار شکست کھا کر وہ بوکھلا جاتی ہے۔ چنانچہ وہ عالم تذبذب میں عشق سے کچھ سوالات کے جوابات مانگتی ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ عشق کے پاس اُن کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ عقل عشق سے پوچھتی ہے کہ نفرتوں کی آندھی میں محبتوں کے چراغ جلائیں تو کیسے؟ بے وفائی کے طوفان میں وفا کا پتوار چلائیں تو کیسے؟ بد نیتی کے دور میں جامۂ اخلاص سجائیں تو کیسے؟ بدخواہوں کی محفل میں دوستی کا ہاتھ بڑھائیں تو کیسے؟ فاصلوں کے مکتب میں قربتوں کے سبق پڑھائیں تو کیسے؟ غموں کی بارش میں لبوں پر مسکان سجائیں تو کیسے؟ دلِ ویراں میں ارمانوں کے پھول کھلائیں تو کیسے؟ درندوں کی دنیا میں اپنی خیر منائیں تو کیسے؟ پیاسی انسانیت کو خونِ جگر پلائیں تو کیسے؟ بت پرستوں کو لا الٰہ کی اذان سنائیں تو کیسے؟ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگائیں

تو کیسے؟ سنگ دل دنیا کو سوزِ جگر بتلائیں تو کیسے؟ ساقی کی بخیلی پر ہم روئیں رلائیں تو کیسے؟ سلگتے ارمانوں پر اشکوں کی برسات برسائیں تو کیسے؟ مچلتے ارمانوں کو تسلی دلائیں تو کیسے......؟

عقل عشق پر ایسے ہی ان گنت سوالوں کی بوچھاڑ کرتی رہتی ہے۔ عشق زیرلب مسکراتا رہتا ہے اور عقل کی دیوی سے کہتا ہے کہ محبت خالص اور بے غرض ہو تو نفرت و کدورت کی گھٹا ٹوپ آندھی چاشنی کے لطیف جھونکوں میں بدل جاتی ہے اور نفرت کے اندھیروں میں محبتوں کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ طوفانوں میں کشتی چلانا دیوانوں کا کام ہے۔ دیوانے طوفانوں سے ڈرتے نہیں ہیں بلکہ بڑھتے طوفان ان کے ارادوں کو مہمیز کر دیتے ہیں اور وہ منزل پا کر ہی دم لیتے ہیں۔ محفل بدخواہوں کی سہی مگر اپنا دل تو بدخواہ نہیں ہے۔ جس دل میں خلوص اور محبت کی چاندنی بکھری ہو اسے خیر خواہ مل ہی جاتے ہیں۔ فاصلوں کے مکتب میں بھی قربتوں کے سبق پڑھائے جا سکتے ہیں بشرطیکہ قریب آکر ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھا جائے اور دلوں کو محبت و ہمدردی کی لڑی میں پرو یا جائے۔ غموں کی بارش اگر ہو بھی تو کیا غم، ہم راحتوں کی دھوپ کا سونا بکھیر دیں گے مسکان کے پھول خود بخود کھل اٹھیں گے۔ دلِ ویراں کو ایمان کے نور سے سرسبز وشاداب رکھیں گے تو ہر طرح کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں۔ درندے تو درندے ہیں۔ ہم اگر انسان بنے رہیں گے وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ انسانیت بھائی چارہ، اخوت و یگانگت، ایثار و ہمدردی، پیار و محبت، عدل و انصاف اور امن وسکون کی پیاسی ہے۔ اسے اگر یہ ساری چیزیں شب وروز مہیّا رہیں تو شدّت پیاس کا غم اسے کبھی نہیں کھائے گا۔ بت پرستوں کو لا اللہ کی اذان سنانے کے لیے معرکہ بدر و احد سر کرنے پڑیں گے، جانوں کا نذرانہ دینا پڑے گا، جلاوطنی کا درد سہنا پڑے گا اور تپتے ریگزاروں کو

پاٹنا پڑے گا۔ اگر حکمت و دانائی کا ایسا جادو سیکھا جائے جس سے ٹاٹ کے کھر درے وجود میں ریشم سی کوملتا پیدا ہو جائے تو ریشم میں ٹاٹ کا پیوند بھی لگ سکتا ہے۔اہل جہاں کے دل پتھر ہیں ان میں نرمی مت ڈھونڈ۔ اپنا سوز جگر دوسروں کو نہیں بتلایا کرتے ۔دیوانے اسے دل کی گہرائیوں میں چھپایا کرتے ہیں۔جو دیوانے اپنے اشکوں کے جام پینے کے عادی ہوتے ہیں انہیں ساقیوں اور ساغروں کی چنداں ضرورت نہیں ۔ اے عقل کی دیوی کیا یہ راز ابھی تم پر افشاں نہیں ہوا ہے کہ دیوانوں کے ارمان کبھی مچلتے سلگتے نہیں ہیں۔

عشق کے دیوانہ وار جوابات سن کر عقل پسیج گئی۔ وہ حیران و ششدر رہ گئی۔ کہاں عقل کی نزاکت اور خودنمائی اور کہاں عشق کی دیوانگی اور جنون۔ عقل ہار گئی اور میدان چھوڑ کر چلی گئی۔ اس طرح انسان صرف عشق کے بل بوتے پر زندگی گزارتا رہا اور جب انسان نے خود کو عشق کے حوالے کیا تو تاریخ رقم ہونے لگی۔ حضرت ابراہیم کو عقل نے بہت رکایا کہ آگ انسان کو جلاتی ہے مگر ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

عقل نے اسے ڈانٹ بھی پلائی کہ اپنی اکلوتی اولاد کو ذبح مت کر مگر عشق کے دیوانے نے اسمٰعیل کے گلے پر چھری چلا ہی لی۔ طارق بن زیاد نے دریا پار کر کے اپنی کشتیاں جلا ڈالیں تو عقل نے اسے بہت کوسا مگر عشق نے پیٹھ تھپتھپا کر مرحبا کہا۔ کربلا کے میدان میں عقل نے کئی جتن کیے کہ حسینؑ تنہائی میں اپنا سر قلم نہ کرائے مگر عشق نے پہلے عقل کا سر قلم کر دیا اور پھر حسینؑ کے ہاتھوں دیوانگی کی تاریخ رقم کرالی۔ فرہاد نے عقل سے پوچھا کہ پہاڑ کاٹوں کہ نہیں تو عقل کی مہ پری نے جواب میں کہا:

''فرہاد دیوانے ہو گیا؟ کہاں تم گوشت پوست کا ڈھانچہ اور کہاں آسمان سے باتیں کرتا پہاڑ۔''

عشق نے فرہاد کو سمجھایا ''فرہاد تمہارے اندر عزم و ہمت کا ایسا پہاڑ ہے جس کے مقابلے میں یہ پہاڑ مٹی کی ڈلی کے برابر بھی نہیں ہے۔ ارادہ کرو اور لگ جاؤ کام میں۔''

یوں عشق کی رہنمائی میں فرہاد نے پہاڑ کا جگر کاٹ کر وہ جوئے شیر لائی جو ایک تاریخ بن گئی۔ شاہجہاں نے ممتاز کے عشق میں تاج محل بنوایا تو عقل انگشت بدنداں رہ گئی۔ کہاں عقل کی وہ مصلحت اور کہاں عشق کی وہ چھلکتی دیوانگی کہ تاج محل تاریخ عالم کا ایک ناقابل تسخیر حصہ بن گیا۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصۂ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

عقل دیکھنے میں بہت بھلی لگتی ہے۔ اس کے مشورے ہمیں کافی وزن دار لگتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہماری مرضی کے عین مطابق مشورہ دیتی ہے۔ اس کے پاس دلائل ہیں، کہانیاں ہیں، حیلے بہانے ہیں، مصلحت پسندی ہے اور چاپلوسی ہے۔ عقل عیار ہے سو بھیس بدلتی ہے اور بڑی ہوشیاری سے انسان کو اپنا غلام بنا دیتی ہے۔ اُسے اپنے حسین اور دلکش شکنجے میں جکڑ لیتی ہے اور انسان کو تب احساس ہوتا ہے کہ اس نے عقل کی غلامی تسلیم کی ہے جب وہ اپنے اندر کوئی جوش یا جذبہ نہیں پاتا ہے، جب اسے لگتا ہے کہ اس کی ندگی میں جمود سا چھایا ہے، جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آرام وسکون میں کرب کی بو نہیں ہے، جب اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی خوشیوں میں غم کی آمیزش نہیں ہے، جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی ہنستی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی نہیں چمک رہے ہیں۔ جب اس پر یہ حقیقت آشکارا

ہو جاتی ہے کہ اس کی مسکراہٹوں پر اشکوں کے پہرے نہیں ہیں اور جب وہ اس راز کو پالیتا ہے کہ اس کے گلشن حیات کی گھات میں کوئی صیاد نہیں ہے۔ وہ فوراً اپنے ضمیر کی آواز سن کر عشق کی غلامی میں آجاتا ہے کیونکہ عشق کے قدموں میں آکر اس کے ضمیر کی تشفی ہو جاتی ہے اور اسے اپنی زندگی کا مقصد پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

حالانکہ عشق کی غلامی میں آکر اسے آلام و مصائب کا جھولا جھولنا پڑتا ہے، خوشی کھوجنے کے لیے آنسوؤں کے سمندر میں ڈبکی لگانی پڑتی ہے، درد کی شاہراہ پر رواں راحتوں کے قافلے کھوجنے پڑتے ہیں، غمناکیوں کی کڑکتی بجلیوں میں مسرتوں کے آشیانے تعمیر کرنے پڑتے ہیں، مہر و ماہ سے نور کی بوندیں چُرا کر حلقۂ ظلمت کو پاش کرنا پڑتا ہے، اپنے لہو سے وضو کر کے نمازِ عشق ادا کرنی پڑتی ہے، تاریکیوں میں اجالا کرنے کے لیے اپنی محفل کے شمس و قمر دینے پڑتے ہیں، ظلم و جبر کے خارزاروں پر اپنی پلکیں بچھانی پڑتی ہیں، گنگھور اندھیروں میں دل کے جگنو سجانے پڑتے ہیں، قفس میں رہ کر چاشنی کے گیت گانے پڑتے ہیں اور حیوانیت کی تند ہواؤں میں انسانیت کی شمع روشن رکھنی پڑتی ہے۔ مگر اسے زندگی کی یہ ساری کلفتیں سہنے میں مزا آتا ہے کیونکہ دیوانوں کو وہ زندگی بھی موت لگتی ہے جس میں ہیجان نہ ہو، جس میں تلاطم نہ ہو، جس میں کہرام نہ ہو، جس میں پریشانیوں کے اٹکاؤ نہ ہوں، جو آزمائشوں سے لبریز نہ ہو، جو دار و رسن نہ دیکھے، جو آگ و آہن نہ دیکھے۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عقل انسان کو ہمیشہ پیش و پس میں الجھا دیتی ہے۔ وہ اسے ایک مست گھوڑے کی طرح اپنی پیٹھ پر سوار کر کے گول گول گھماتی رہتی ہے مگر منزل کی ہوا بھی

سونگھنے نہیں دیتی ہے۔اس کے برعکس عشق انسان کی رگ و پے میں سرایت کر کے اس کے وجودِ خاکی کوایک انمول پیکر بنا دیتا ہے۔یہی انسان عاشق کہلاتا ہے جواپنے معشوق کی رضا کی خاطراپنی ہر رضا کوقربان کرتا رہتا ہے۔وہ عشق کے بل بوتے پر ایسے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔اقبال کہتے ہیں:

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

......☆☆......

زندگی......!

تضاد کے پھول

اللہ عزوجل نے جہاں دنیا میں انسان کی خاطر لازوال نعمتیں مہیا رکھی ہیں وہاں اس دنیا کو تضادات سے بھی مالا مال کر کے رکھ دیا ہے۔قدرت نے کوئی چیز بنانے سے پہلے اس کی ضد تخلیق کی ہے۔اُس کی یہ تخلیقِ ضد نہایت ہی اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ کسی چیز کو اس کی ضد سے بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔نیک کو بد سے، دن کو رات سے،زمین کو آسمان سے یا پھر سفید کو کالے سے وغیرہ وغیرہ۔ یقیناً اسی بنا پر انسانی زندگی میں کہیں خوشیوں کا موسم تو کہیں غموں کی برسات۔کہیں برستی برکھا تو کہیں جھلستی دھوپ۔اِدھر دن کے اجالے تو اُدھر گنگھور گھٹا۔اِدھر پیار ومحبت کی بھینی بھینی خوشبو تو اُدھر نفرت وکدورت کی گھٹن۔کہیں دولت کی ریل پیل تو کہیں کشکول لیے بھکاری۔کہیں اونچی حویلیاں تو کہیں مٹی کے گھروندے۔ کہیں عدل وانصاف کی حکومت تو کہیں ظلم وجبر کا راج۔کہیں تپتے ریگزار تو کہیں

سرسبز مرغزار۔ کہیں لبا لب دریا تو کہیں جانگداز خشک سالی۔ کہیں وفا کی مسحور کن خوشبو تو کہیں بے وفائی کی دم گھٹا دینے والی بدبو۔ کہیں شفقت و ہمدردی کی ٹھنڈی چھاؤں تو کہیں بغض و عناد کی جگر سوز تمازت۔ کہیں حسن و جمال کی رعنائیاں تو کہیں بدصورتی کے بھیانک نمونے۔ کہیں گلوں کا رنگ و بو تو کہیں کانٹوں کی چبھن۔ کہیں انسانیت کے علمبردار تو کہیں شیطانیت کے پرستار۔ کہیں عالموں اور فاضلوں کی دانشگاہیں تو کہیں جہالت و حیوانیت کے مکتب۔ کہیں پدرانہ شفقت کی لہلہاتی فصل تو کہیں نافرمانی کی بجلیاں۔ کہیں حیات بخش نخلستان تو کہیں پُر فریب سراب۔ کہیں سکھ کے بادل تو کہیں غم کی تند ہوائیں۔ کہیں دیانتداری کے قدرداں تو کہیں بد دیانتی کے چاہنے والے۔ کہیں سچ کی مدح سرائی تو کہیں جھوٹ کی حکمرانی۔ کہیں شرم و حیا کی عظیم مثالیں تو کہیں عُریانیت کے ایمان سوز مناظر۔ کہیں رزقِ حلال کے خزانے تو کہیں مالِ حرام کے انبار۔ کہیں پسینے سے شرابور محنت کش تو کہیں کنیزوں کے جھرمٹ میں شہزادے۔ کہیں جوانی کا نشہ تو کہیں بڑھاپے کی ندامت۔ اس حوالے سے اگر مثالیں پیش کرتے رہیں تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آئے گی لیکن مثالیں ختم نہیں ہوں گیں۔

فرض کریں یہ تضاد نہیں ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہی کہ دو میں سے صرف ایک چیز ہوتی۔ نیکی یا بدی۔ سچ یا جھوٹ۔ اندھیرا یا اجالا۔ بہار یا خزاں۔ اگر ہم روز ایک ہی ضیافت کھاتے تو شاید ضیافتیں ضیافتیں نہیں رہتیں۔ اگر صرف بارشیں ہوتیں تو بارش ہمارے لیے کیا معنیٰ رکھتی۔ اگر صرف برائی ہوتی تو کیا برائی برائی ہوتی۔ اگر صرف جنت ہوتی تو جہنم کی دہکتی آگ کا تصور ہمیں خوف سے کبھی آشنا نہیں کرسکتا۔ اگر ہمارا کوئی دشمن ہی نہیں ہوتا تو دوستی کی حلاوت ہم کیسے محسوس کرتے۔ اگر ہم بڑھاپے کی دہلیز پر کبھی قدم ہی نہیں رکھتے تو جوانی میں کشش کہاں

سے آجاتی۔ اگر صرف مرد ہوتے اور عورت نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہوتی یا صرف عورتیں ہوتیں تو زندگی میں کیا خاک چاشنی ہوتی؟ اگر جنگ و جدل نہیں ہوتا تو امن کی فاختائیں کون اڑاتا۔ اگر ہم ہمیشہ خوش وخرم رہتے یا یہ کہ ہمیشہ غمنا کیوں میں ڈوبتے رہتے تو زندگی بے مصالحے پکوان کی مانند بے مزہ ہوتی۔

اس لحاظ سے تو دنیا کے سارے تضادات ہماری زندگی کے لذیذ پکوان کے لیے گرما گرم مصالحے ہیں جن کے بغیر زندگی میں مہک ہوگی اور نہ رنگ۔ بالکل پھیکی ہوتی ہماری یہ زندگی جس سے ہم اتنا پیار کرتے ہیں۔ یہ گرمیوں میں بارشیں۔خزاں کے بعد بہار، شب کی ظلمتوں کے بعد دن کے حسین اُجالے۔ غموں کی آندھی کے بعد خوشیوں کی برسات۔زندگی کی گہما گہمی کے بعد موت کا سناٹا، رقابتوں کے بعد رفاقتیں، فاصلوں کے بعد قرابتیں، اشک فشانی کے بعد مسکراہٹوں کے سلسلے۔اسی سے زندگی کی رونقیں ہیں۔کالی رات کی کوکھ سے ہی تو اجالے جنم لیتے ہیں۔کڑاکے کی ٹھنڈ کو پگھلانے کی خاطر ہی گرمیاں وجود پذیر ہو جاتی ہیں۔غموں کی آہٹ سے ہی خوابیدہ راحتیں جاگ جاتی ہیں۔کڑکتی دھوپ ہی ہمیں ٹھنڈی چھاؤں کی لذت کا لطیف احساس دلاتی ہے۔آلام و مصائب ہی ہمیں جینے کے گُر سکھاتے ہیں۔بے وفائی کی مار کھانے کے بعد ہی ہمیں وفا کی قدر و قیمت معلوم پڑ جاتی ہے۔تھک کے چور ہو جانے کے بعد ہی نیند کی آغوش ہمیں پناہ دیتی ہے۔دو آنسو بہا کر ہی ہم مسکراہٹوں کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔بھوک کی تڑپ ہی ہمیں خورد ونوش کی لذت بتا دیتی ہے۔

یوں خداوندِ کریم نے انسانی زندگی کو تضادات سے آراستہ کر کے ہم پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔وہ خالق ہے اور بخوبی جانتا ہے کہ کس مخلوق کے لیے کس چیز کی کتنی اہمیت ہے۔قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی تضاد کی کئی مثالیں سامنے

آجاتی ہیں مثلاً خلد اور جھنم۔الیل اورالنھار۔الحی اور الموت۔الحمیم اور کوثر۔الشتاء اور السیف۔المؤمن اور الکافر،الرجل اور النساء،السماء اور الارض......وغیرہ۔اسی تضاد کی وجہ سے کائنات کی میزان کاتوازن برقرار ہے۔زندگی کی رعنائیاں اسی تضاد کی مرہونِ منت ہیں۔

جب ہم اپنے سیرت و کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری زندگی بھی تضادات سے بھری پڑی ہے۔ہمارے قول وفعل میں تضاد ہے۔ ہمارے ظاہر و باطن میں تضاد ہے۔ہمارے خیالات وعملیات میں تضاد ہے۔ہم ہی انسانیت کے علمبردار اور ہم ہی شیطانیت کے پرستار۔عالم ہم تو جاہل بھی ہم ہی۔ہم ہی منصف ہم ہی مجرم۔جہاں ہم یتیم خانوں کے روحِ رواں ہیں وہاں یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ معصوم بچے ہمارے ہی ظلم کا شکار ہو جاتے ہیں۔جواں عورتوں کے سہاگ ہم اجاڑتے ہیں اوران کی بعض آبادکاری کا ٹھیکہ بھی ہم ہی لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ قانون کے محافظ بھی ہم ہی اور قانون شکن بھی ہم ہی۔

تضاد۔ہر جگہ تضاد مگر یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ اگراس دنیا میں یہ سارے تضادات نہ ہوتے تو ہماری ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں نکھار آنا ناممکن تھا۔جدید دور کی راحت رساں ایجادات کا مؤجب بھی یہی تضادات ہیں۔لمبے لمبے فاصلوں کوقربتوں میں بدلنے کے لیے انسان نے محیر العقل مواصلاتی آلات ایجاد کیے۔موت کو زندگی سے دور رکھنے کے لیے انسان نے کتنی بلندیاں سرکیں۔ دشمن کے وجود نے انسان کو تیغ وتفنگ بنانے پر مجبور کیا۔بڑی بڑی سلطنتیں فتح کرنے کی ترغیب دی۔دلیری اور جوانمردی کی عظیم مثالیں قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ جہالت کا اندھیرا ہی ہے جو ہمیں علم وحکمت کی دانش گاہیں کھولنے پر مجبور کرتا ہے۔نفرت وکدورت کے تپتے ریگزار ہی ہمیں پیار ومحبت کا بیج بوکر امن وآشتی

کے مرغزار سجانے پر مجبور کرتا ہے۔انہی تضادات سے ہماری زندگی کے تانے اور بانے بُنے ہوئے ہیں۔ ہرایک چیز کا اس کی ضد کے ساتھ ایک گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے ساتھ جُڑا ہوا ہے۔کل ملا کر یہ بات طے ہے کہ کسی چیز کو اگر صحیح طور پر پہچاننا ہے تو پہلے اس کی ضد کو پہچاننا لازمی ہے۔ لہٰذا مسرتوں سے جوجھنے کے لیے غم کے سمندر میں ڈبکی لگانا ضروری ہے۔امن قائم کرنے کے لیے جنگ لڑنا لازمی ہے۔گُلستانِ انسانیت میں بہار لانے کے لیے شیطانیت کے وار سہنے ضروری ہیں۔وفا کی قندیلیں روشن رکھنے کے لیے ہمیں بے وفائی کی آندھی سے الجھنا ہی الجھنا ہے......

پھر ہم کتنے کوتاہ عقل ہیں کہ اگر ہم اس تضاد بھری دنیا کے تضادات سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس بحث میں الجھ جائیں کہ ہماری زندگی میں فتنہ و فساد کیوں ہے،سکھ کے بادلوں کو کیوں دکھ کی ہوائیں اڑا لیتی ہیں،محبتوں کے چراغ نفرت کی ہواؤں سے کیوں الجھتے ہیں، دن کی تابانی کو کالی رات کی دیوی کیوں فناہ کرتی ہے،معصوموں کی جانیں کیوں تلف ہو جاتی ہیں۔یہ سب کچھ تو ہماری زندگی کا حصہ ہے۔جس سمندر میں بڑے بڑے مگر مچھ ہوں،طوفانی لہریں ہوں، مدو جزر ہو، قذاقوں کی فوج ہو،ساحل اوجھل ہوں،اور اوپر سے ستارے گم گشتہ ہوں اس میں ہمارا سفینہ حیات ہچکولے نہیں کھائے گا یہ کیسے ممکن ہے۔زندگی کے مختلف دوراہوں پر قدم ڈگمگانا ایک لازمی فعل ہے۔اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ڈگمگا کر،ٹھوکریں کھا کر، گرکرخاک چاٹ کر ہم سنبھل پاتے ہیں یا حادثات کی رو میں بہہ کر ہمیشہ کے لیے قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔جس طرح سمندر میں پھیلے ہوئے مچھیرے اُٹھتی ہوئی طوفانی لہروں سے محظوظ ہو جاتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی غم کی ہواؤں سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ہمیں یہ بات اپنے دل و دماغ میں

بٹھا کر خود کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ خوشی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا جہاں ہمارے گھروں میں خوشی ہوگی وہاں لازماً غم بھی ہوگا۔ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے کہ سورج طلوع ہونے کے لیے ہی غروب ہو جاتا ہے، رات کا مہیب اندھیرا نئے اجالوں کی نوید سنانے کے لیے ہی چھا جاتا ہے، خزاں کے بے رحم ہاتھ ہی آنے والی بہار کے امین ہوتے ہیں، جنگ کے بعد ہی امن قائم ہو جاتا ہے، امتحان کے بعد ہی نتیجہ نکلتا ہے، دانا خاک میں مل کر ہی گل و گلزار ہوتا ہے اور دریا سمندر میں گر کر اور اپنا وجود کھو کر ہی ایک لازوال سکون پاتا ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

دل دیکھتا ہے آنکھ نہیں

اقوام متحدہ کے سابق سکریٹری جنرل جناب کوفی عنان اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں ایک بار اُن کے استاد نے کلاس روم میں آکر بلیک بورڈ پر ایک بڑا سا سفید ڈرائنگ شیٹ چسپان کیا۔اس سفید شیٹ کے کونے میں ایک روپیہ کے سکے کے برابر کالے رنگ کا دھبہ تھا۔کوفی عنان کہتے ہیں کہ ان کے استاد نے اُن سے ایک ایک کر کے یہ پوچھ لیا کہ انہیں کیا نظر آرہا تھا۔سب لڑکوں نے جواب میں کالے دھبے کا ذکر کیا۔ استاد کافی مایوس ہو گئے کیونکہ ہر طالب علم کو صرف کالا دھبہ نظر آگیا جب کہ سفید رنگ کا لمبا چوڑا شیٹ کسی ایک کی نظر میں نہیں آگیا......

ایک اور مثال لیتے ہیں ۔ایک بار ایک بزرگ استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ کسی جنگل میں سے جارہے تھے کہ راستے میں انہوں نے ایک مرا ہوا خچر

دیکھا۔ اس کی ہڈیاں سڑی ہوئی تھیں اور اس کے مردہ جسم سے بدبو اور عفونت اس قدر پھیل رہی تھی کہ پاس سے گزرنا مشکل تھا۔ بزرگ خاموش رہا۔ شاگردوں میں سے کسی نے ناک پر کپڑا رکھا تو کسی نے سارا منہ لپیٹ لیا۔ کسی نے ''اف یہ بدبو اور یہ سڑانڈ'' کہہ کر راستہ بدل دیا۔ بزرگ نے سب کو مردہ خچر کے بالکل سامنے لا کر کہا کہ دیکھو اس کے سفید موتیوں جیسے دانت کس طرح ابھی بھی چمک رہے ہیں۔ شاگرد بھی بہت ہی ذہین تھے۔ انہیں فوراً اس بات کا افسوس ہونے لگا کہ انہیں صرف گندی چیزیں نظر آ گئیں اور موتیوں جیسے چمکیلے دانت دکھائی نہیں دیے۔ انہوں نے استاد سے معافی مانگ لی اور استاد بھی شاگردوں کی ذہانت دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

بات صاف ہے کہ ہماری آنکھیں کھلی ہوں تو سامنے کی کوئی بھی چیز نظر آئے گی مگر غور طلب بات یہ ہے کہ نظر آنے والی بے شمار چیزوں میں سے کونسی چیز پر ہماری نظریں رُک جاتی ہیں۔ کیا اُس وقت نگاہوں، سوچ اور دل کے بیچ کوئی تال میل ہوتا ہے؟ یعنی کیا ہماری نگاہیں اُسی چیز کو پکڑ لیتی ہیں جو ہمارے دل و دماغ کی چاہ ہوتی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف دیکھنے والا ہی دے سکتا ہے۔

ہماری متلاشی نگاہیں اگر بھرے بازار میں اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی ہیں تو ہمیں وہ سینکڑوں بچّے دکھائی نہیں دیں گے جو ہمارے پہلو سے ٹکرا کر ہماری ناک کے تلے سے گزر جاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ہمارا دل و دماغ آنکھوں کے ذریعے ایک خاص قسم کی شکل وصورت والا بچہ تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہماری نظریں بیک وقت اپنے بچے کو بھی تلاش کریں گی اور ساتھ ہی دوسری بے شمار چیزوں یا انسانی چہروں کو بھی پردۂ بصارت پر محفوظ کر لیں

گی۔ہم بار ہا ایسی چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کی نظروں کو تلاش نہیں ہوتی ہے یا وہ چیزیں دیکھ لیتے ہیں جن کی ہمارے دل و دماغ کو چاہ نہیں ہوتی ہے......مثلاً تپتے ریگزاروں میں سراب کی بات کریں۔ہمیں تپتی ریت پانی کا چشمہ کیوں لگتی ہے۔ اس لیے کہ ہم پیاسے ہوتے ہیں اور دل و دماغ کو پانی کی تلاش ہوتی ہے۔ سراب کا دھوکہ کھا کر نگاہیں مایوس ہو جاتی ہیں لیکن دل و دماغ نگاہوں کو پھر سے سراب کے دھوکے سے دوچار کرتے رہتے ہیں۔اصل میں انسان چیزوں کو ہمیشہ اسی انداز سے دیکھتا ہے جو اس کے اندر کی کیفیت سے میل کھاتا ہو۔اس کے اندر اگر کالا پن ہے تو اس کی نگاہوں کو سفید چمچماتی برف بھی کالی نظر آتی ہے۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ہماری نظروں کو وہ چیز دکھائی نہیں دیتی ہے جسے وہ دیکھتی ہیں بلکہ انہیں وہ چیز نظر آتی ہے جو دل و دماغ کو مطلوب ہوتی ہے۔

ایک عام رجحان ہے کہ ہم ہر کسی کے بارے میں دل میں ایک خاص قسم کی رائے قائم کر لیتے ہیں اور اس شخص کے بارے میں ہمیشہ اپنے دل سے پوچھ کر ہی کوئی بات کرتے ہیں۔اگر کسی شخص کو ہمارا دل امانت دار مان لیتا ہے تو نظروں سے ہم اس کی بددیانتی کے کتنے ہی قصے دیکھ لیں ہمیں وہ بددیانت لگتا ہی نہیں ہے۔اسی طرح اگر ہمارے تصور میں کوئی جھوٹا اور مکّار ہے تو کھلی آنکھوں سے اس کی سچائی اور خلوص کا ثبوت دیکھ کر بھی ہم اسے حق گو اور راست باز ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔یہ معاملہ سنگین نوعیت کا اس لیے بن جاتا ہے کہ ہم اکثر دوسروں کے بارے میں بری رائے ہی قائم کر لیتے ہیں۔ اخلاقیات کا تقاضا یہی ہے کہ ہمیں ہمیشہ دو ہی چیزیں نظر آتیں اپنی خامیاں اور دوسروں کی خوبیاں لیکن افسوس کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔اخلاقیات کا یہ انمول درس ہم نے یا تو پڑھا ہی نہیں ہے یا پھر پڑھ کے بھلا دیا ہے۔ہمیں کیچڑ نظر آتا ہے مگر اس کے اندر کھلتے

کنول کے پھول نظر نہیں آتے۔ گندگی کے ڈھیر پر بیٹھی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہمیں صاف صاف محسوس ہو جاتی ہے اور ہم تلملا اٹھتے ہیں لیکن اس روشن حقیقت کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا ہے کہ یہی مکھیاں نظام قدرت کے میونسپل کارکن ہیں جو ہمارے لیے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور نقصان دہ چیزوں کو اپنی غذا بنا کر ہمارے لیے ماحول کو پاک و صاف بنا ڈالتی ہیں۔ نجس کتوں کی ہڑ بونگ سے ہم سبھی اکتا جاتے ہیں اور ہم ذہنی کوفت سے دوچار ہو جاتے ہیں لیکن ہم اس حقیقت سے کیسے انکار کرسکتے ہیں کہ کتا نظام قدرت کا ایسا جزو ہے جو حیات انسانی کو کئی فیض پہنچاتا ہے۔ ہمیں بڑے بڑے نوکیلے کانٹے دکھائی پڑتے ہیں لیکن ان پر خطر کانٹوں کی حصار میں مہکتے گلاب نظر نہیں آتے۔ ہمیں ہرن کے وہ خوبصورت سینگ نظر آتے ہیں جو اس کی موت کا باعث بھی بن جاتے ہیں مگر اس کی وہ پتلی پتلی بدصورت ٹانگیں دکھائی نہیں دیتی ہیں جن کی اچھال اسے موت کے پنجے سے بھاگنے میں مدد دیتی ہیں۔ ہم جنگلی درندوں کی چیر پھاڑ کو ذہن میں لاتے ہی تھر تھر کانپ اٹھتے ہیں مگر ماحولیاتی توازن کے حوالے سے ان کے رول کو ہم کسی صورت نظر انداز نہیں کرسکتے ہیں۔

بات مثبت اور تعمیری سوچ وفکر کی ہے۔ سوچ مثبت ہو تو ہماری آنکھیں منفی کبھی دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ اچھی سوچ رکھنے والوں کو شہد کی مکھی کا کانٹا کبھی نظر نہیں آتا ہے کیونکہ انہیں صرف شہد کی حلاوت دکھائی دیتی ہے۔ یہ تعمیری سوچ وفکر کا ہی نتیجہ ہے کہ ہزار ناکام کوششوں کے باوصف انسان ہوا میں اڑان بھر سکا۔ یہ مثبت سوچ کے طفیل ہی ممکن ہے کہ ہر ناکامی کے بعد انسان اپنی آنکھوں میں کامیابی کے خواب سجاتا ہے۔ لہٰذا لازمی بن جاتا ہے کہ ہماری نگاہیں ہر ایک چیز کو مثبت انداز میں دیکھ لیں۔ ہمیں کسی انسان کا پھٹا لباس نظر تو آتا ہے مگر اس پھٹے

لباس کے اندر لپٹا ہوا سجا سجیلا انسان دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ہمیں اندھیرا دکھائی پڑتا ہے لیکن نور کی کرنیں نہیں۔

ہمارے دلوں میں یہی کچھ رچا بسا ہے کہ اپنے بغیر کوئی سچ بولتا ہی نہیں ہے۔ اپنے سوا سارے جھوٹے ہیں، فریبی ہیں اور مکار ہیں۔ عبادت تو صرف ہماری ہوئی باقی تو محض دکھاوا کرتے ہیں۔ ہمارا دل آنکھوں کے راستے جو کچھ دیکھنا پسند کرتا ہے وہ قطعاً مثبت نہیں ہوتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے کا ہر فرد گفتگو میں، اٹھنے بیٹھنے میں، علیک وسلیک میں، رفاقت میں، رشتوں میں، دوستی اور بھائی چارے میں ایک تلخی سی محسوس کرتا ہے۔ ایسی صورتحال میں ایک دوسرے پر اعتماد کا فقدان ایک ڈراؤنے بھوت کی طرح ہمارے دل و دماغ پر دن رات حاوی رہتا ہے۔ یوں زندگی ہمارے لیے تلخ ثابت ہو جاتی ہے۔

یہ کھیل ہم ہر جگہ کھیلتے ہیں۔ مذہبی امور ہوں یا سیاست کا میدان ہو۔ ہمسائیگی کے تعلقات ہوں یا رشتوں کے بندھن ہوں، کہیں پر بھی ہم اپنی نگاہوں پر چڑھی مخصوص قسم کی عینک اتارنے کو تیار ہی نہیں لگتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ اگر ہم ہمیشہ دوسروں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے۔ اگر ہم اپنے سوا ہر مخلوق کو اپنے سے کہیں زیادہ سچا اور ایماندار تصور کرتے۔ اگر ہم دوسروں کو اپنے اوپر فوقیت دے کر خود کو حقیر سمجھتے۔ اگر ہم انانیت کا شکار ہونے کے بجائے عجز و انکساری سے کام لے کر ماحول کی کڑواہٹ کو اپنی شیریں گفتاری سے زائل کر دیتے......تو ماحول کیسا ہوتا؟

......☆☆......

زندگی......!

رسم ورواج کی ماری

جب سے یہ دینا معرض وجود میں آئی ہے انسانی زندگی کا رہن سہن ہر اتار وچڑھاؤ اور پیچ وخم کے ساتھ رنگ بدلتا رہا۔طرح طرح کے رسم و رواج جنم لیتے رہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ مٹتے رہے۔البتہ ایک چیز ضرور ہے جس پر کہ حیات انسانی برابر ٹکی ہوئی ہے اور وہ ہے سماجی ڈھانچہ۔سماجی ڈھانچے کے خدوخال مختلف قسم کے رسم ورواج مرتب کرتے ہیں۔رسمیں ہر زمانے میں اور ہر معاشرے میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہیں۔کچھ رسمیں براہ راست مذہب کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں اور کچھ معاشرتی زندگی کی ضروریات کے طور پر جنم لیتی ہیں اور کچھ رسمیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ انسانی زندگی کے لوازمات کے طور ان کی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ایسی رسمیں لوگ، خصوصاً اعلیٰ طبقے کے اپنی منشا اور حیثیت کے مطابق متعارف کراتے ہیں۔اُن کی

دیکھا دیکھی میں غریب اور اوسط طبقے کے لوگ بھی اس مرض کے شکار ہو جاتے ہیں۔وہ کہیں سے پیسہ ادھار لا کر یا پھر بینک سے قرضہ لے کر اپنی مصنوعی امیرانہ ادا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔شادی بیاہ کا مسئلہ ہو یو ماتم پُرسی کی بات ہو، بچوں کی تعلیم وتربیت کا معاملہ ہو یا مکان کی تعمیر وتجدید مقصود ہو،لباس کی بات ہو یا کھانے پینے کی، یہاں تک کہ عبادات کے معاملات میں بھی رسم ورواج کا چلن عام ہو چکا ہے۔

شادی بیاہ کی مثال لیجیے۔نکاح شادی کا لُبِ لباب ہوتا ہے مگر اس کا تقدس محیر العقل رسومات نے پامال کر کے رکھ دیا ہے۔بنیادی طور پر نکاح کا فلسفہ اور پسِ منظر یہ ہوتا ہے کہ یہ بات مشتہر ہو جائے کہ فلاں لڑکے کا نکاح فلاں لڑکی کے ساتھ طے پایا ہے اور یہ کہ ان کے ازدواجی تعلقات میں شرعی اور قانونی جواز بدرجہ اتم موجود ہے۔اس کا اثر یہ ہوگا کہ معاشرے میں اس حوالے سے کوئی نظم شکنی پیدا نہیں ہو جائے گی۔مگر اپنی جاہ وحشمت کی نمود ونمائش کے لیے رسم ورواج کے پجاری نکاح جیسی رسمِ اطہر کو بھی اپنے من پسند طریقے سے پالنا چاہتے ہیں۔عام طور پر لوگ بیٹیوں کے نکاح کے وقت مہر کے طور پر بڑی سے بڑی رقم طلب کرتے ہیں۔جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اتنی بڑی رقم کی فرمائش کرنے میں کونسی حکمت ہے تو کہتے ہیں کہ بس حفظ ماتقدم ......کبھی اگر خدانخواستہ طلاق کی باری آجائے تو طلاق کی سوچنے والے بہت بڑی رقم ادا کرنے کے ڈر سے طلاق دینے سے گریز کریں گے اور اگر طلاق ہوتی بھی ہے تو معاوضے میں بہت بڑی رقم ملے گی۔نکاح سے پہلے طلاق کی فکر کی جارہی ہے اور اس طلاق میں بھی کاروباری سوچ۔رسمیں ایسے ہی ہمارے سروں پر سوار رہیں تو وہ وقت دور نہیں جب جاہل عربوں کی طرح ہم بھی اپنی بیٹیوں کو زندہ دفنانے میں ہی اپنی عافیت سمجھیں گے۔

شادی بیاہ کے حوالے سے ہی دوسری سب سے بڑی دل دکھانے والی رسم دعوتِ ولیمہ کے نام پر بسیار لذیذ پکوانوں کی ہے جن کی اہمیت بس پیٹ پوجا کے حوالے سے ہے جب کہ ان کی کوئی اخلاقی اہمیت نہیں ہے۔ یہ کس نبی یا رسول کی سنت ہے کہ شادی جیسی مقدس تقریب میں صرف کھانے پینے کے حوالے سے زرِ کثیر خرچ کیا جائے۔ اگر نذر و نیاز کے نام پر مسکینوں اور محتاجوں کو کھلایا جاتا تو ایک اخلاقی جواز بن جاتا تھا۔ ہم کھلاتے پلاتے ضرور ہیں مگر ان لوگوں کو جو کھاتے پیتے خانوادوں سے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا پیٹ بھرتے ہیں جن کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں پر دس پندرہ لوگ اپنا پیٹ پال سکتے ہیں۔ رہی بات مسکینوں اور محتاجوں کی انہیں تو ہم کسی مٹی کے برتن میں بچا ہوا کھانا ڈال کر ایسے پیش کرتے ہیں کہ جیسے ان پر کوئی احسانِ عظیم کیا ہو۔

فضول خرچی کرنا شیطان کے ساتھ بھائی چارہ استوار کرنے کے برابر ہے اور جہاں قوائد وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر رسم رواج کو زندگی کا ضابطہ مان کر پیسہ خرچ کیا جائے وہ فضول خرچی نہیں تو پھر کیا ہے۔ ایک طرف کوئی صاحبِ ثروت لاکھوں روپے ان چیزوں پر خرچ کرتا ہے جو کہ اُس کی ضروریاتِ زندگی کی حدود سے باہر ہیں اور دوسری طرف اُس کی ہمسائیگی میں کوئی جوان لڑکی غربت اور مفلسی کی وجہ سے ہاتھوں میں مہندی لگنے کی منتظر ہوتی ہے۔ غربت کے تھپیڑے کھاتی وہ بنتِ حوا شادی کی عمر کی حد کو پار بھی کر جاتی ہے مگر اسے کہیں سے نکاح کا پیغام نہیں ملتا ہے۔ شادی کا خیال آتے ہی اُس کا دل بیٹھ جاتا ہے کیونکہ اس کے ہمسایہ نے اس کے لیے شادی کے بندھن میں بندھنے کے سارے راستے پُر پیچ بنا دیے ہوتے ہیں۔ جب اس صاحب ثروت سے عشر اور زکوٰۃ اور صدقہ اور خیرات کی بات کرتے ہیں تو اسے بہت برا لگتا ہے۔ اللہ کی راہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے

کی بات چلتی ہے تو صاحب ثروت کے موٹے اور فربہ جسم سے جیسے جان ہی نکل جاتی ہے۔

دولتمندوں کا غیر ضروری مدوں پر بے تحاشہ دولت لٹانا ایک اور غور طلب مسئلے کو جنم دیتا ہے۔ یہیں سے ایسے رسم ورواج جنم لیتے ہیں جو ایک عام انسان کی زندگی کو ایک جان لیوا عذاب بنا دیتے ہیں۔ امیروں کی دیکھا دیکھی میں متوسط اور یہاں تک کہ غریب لوگ بھی حلال اور جائز حدود کو پھلانگ کر راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں جس کا لازمی اثر یہ نکلتا ہے کہ معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اخلاقی ڈھانچے کے تانے اور بانے بکھر جاتے ہیں اور بالآخر ساری اخلاقی قدریں پامال ہو جاتی ہیں۔ اخلاقی بندشوں کو روند کر ایک دوسرے سے سبقت لینے کی جنگ ایک مضبوط سے مضبوط معاشرے کو بھی قلیل مدت میں تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتی ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

ایک دل لبھانے والا دھوکہ

کہتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس ایک منچلا گدھا تھا جو صرف ہری گھاس کھاتا تھا۔ جاڑے کا موسم آ گیا تو گدھے کا مالک پریشان ہو گیا کہ اپنے لاڈلے گدھے کی خاطر تازہ و سرسبز گھاس کہاں سے لائے۔ لاکھ جتن کے باوجود جب وہ شخص ناکام ہوا تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے گدھے کی آنکھوں پر سبز رنگ کی عینک چڑھا دی۔ اس کی یہ ترکیب فوراً رنگ لائی اور گدھا سرسبز گھاس کھانے لگا۔ گدھا اب ہر چیز کو اپنی آنکھوں پر چڑھی عینک کے رنگ سے دیکھتا تھا اور وہ عینک کی ہریالی کے دھوکے میں ایسے آ گیا کہ منہ کا ذائقہ بھی اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ ہری ہری گھاس کھا رہا ہے یا ہریالی کے نام پر کوئی اور چیز۔ بہر حال گدھا تو گدھا ہے یعنی احمقانہ پن اور بے وقوفی کی ایک اعلیٰ مثال اور اس کا فریب میں آنا ایک قدرتی عمل ہے۔ مگر حضرت انسان کا کیا کہیے؟ وہ کیوں زندگی کے ہر موڑ پر دانستہ

یا نا دانستہ طور پر دھوکہ کھا جاتا ہے؟ دراصل زندگی ہی ایک دھوکہ ہے جو ایک چٹیل میدان کی طرح نظر آرہی ہے مگر اس کی سطح پر نظر نہ آنے والے بے شمار نشیب و فراز ہیں۔ یہ نشیب و فراز سر کرنے میں ہم اپنی ساری عمر کھپا دیتے ہیں مگر آخر پر یہی بات ابھر کر آجاتی ہے کہ زندگی کے یہ شام وسحر، یہ رنگ وروپ، یہ مسرتیں وشادمانیاں، یہ لہو ولعب، یہ آب وگل، یہ باغ و بہار، یہ کوہ ودمن، یہ درہم و دینار، یہ جاہ وحشمت، یہ شعر وسخن، یہ نغمہ وساز وغیرہ سب محض ایک دھوکہ ہیں۔ لہٰذا گہری نگاہ اور گہری سوچ رکھنے والوں کو یہ ماننے میں شاید کوئی تأمل نہیں ہوگا کہ زندگی ایک فریب ہے، دھوکہ ہے، ایک خواب ہے، پانی کا ایک بلبلہ ہے۔

جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں وہ تو ایک سراب ہے جس میں تڑپ زیادہ ہے اور تشفی کم۔ ہم اعلیٰ عہدں پر فائض ہوتے ہیں۔ اونچی اور دیدہ زیب حویلیاں ہمارا مسکن ہوتی ہیں۔ ہمارے پاس دولت کی ریل پیل ہوتی ہے۔ سائنسی ایجادات کے طفیل ہماری زندگی عیش پرستی میں گزرتی ہے۔ ہر خوشی ہماری غلام ہوتی ہے۔ سماج میں ہمارا رتبہ ہوتا ہے۔ ایک الگ پہچان ہوتی ہے۔ مگر اچانک سب کچھ بدل جاتا ہے۔ موت ہمیں گلے کیا لگاتی ہے کہ ساری زندگی کا حاصل ایک سراب کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ ایک دم ہمیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ہم وہاں کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ مگر اس دھوکے میں بھی ایک اور دھوکہ ہے اور وہ یہ کہ یہ دھوکہ سب لوگ نہیں کھاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو عمر بھر کبھی ایسا دھوکہ نہیں کھاتے ہیں کیونکہ ان کی نظر اور فکر اتنی گہری ہوتی ہیں کہ زندگی کی رعنائیاں اور دلکشیاں انہیں کسی فریب میں مبتلا نہیں کرتیں۔

یوں تو انسانی زندگی ازل سے ہی فریب کا شکار ہو گئی تھی۔ آدمؑ ابلیس کے

دھوکے میں آکر بہشت سے نکالا گیا تھا اور تا ایں دم وہ مختلف طریقوں سے تواتر کے ساتھ مکر و فریب کے جال میں پھنستا آیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ اپنوں کے ہاتھوں دھوکہ کھا گئے۔ حضرت امام حسینؑ اہلیانِ کوفہ کے ہاتھوں فریب کھا گئے۔ تاریخ کے اوراق اگر اُلٹائیں تو یہی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ دھوکہ اور فریب جیسے ہتھیار استعمال کر کے بہت ساری مقامی اور عالمی جنگیں جیتی یا ہاری گئیں۔ جب توپ و تفنگ، گولہ و بارود اور ٹینک اور بمبار جہازوں سے کام نہ بن پڑا تو انسان نے سب سے مہلک ہتھیار آزما لیا جسے استہزا، دھوکہ یا فریب کہتے ہیں۔ یہ ہتھیار استعمال کرنے میں زیادہ محنت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہے۔ بس دھوکہ دینے والا مکار اور چرب زبان ہو اور دھوکہ کھانے والا سادہ لوح ہو۔

ظاہراً دھوکہ دینے والے دھوکہ کھانے والوں کے برعکس استہزا سے محفوظ رہتے ہیں مگر حقیقتاً یہ بھی ایک دھوکہ ہے کیونکہ خود کو شاطر اور زیرک سمجھنے والے بھی دھوکہ ہی کھا جاتے ہیں۔ وہ اس دھوکے میں رہ جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہوا ہے۔ جب زندگی بجائے خود ایک دھوکہ ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ ایک شخص ہوائی جہاز میں سوار ہو کر یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کہ وہ ہوا میں اڑ رہا ہے کیونکہ جہاز کی لوہے کی موٹی موٹی دیواریں اور چھت اسے اس دھوکے میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ ہوا میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں آرام فرما ہے۔ جیسے ہی یہ بندہ کسی حادثے کی بو سونگھ لیتا ہے تو وہی بھاری بھر کم جہاز اسے ہوا میں اڑتا ہوا ایک گھاس کا تنکا محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم سب مکر و فریب کی باہوں میں جھولتے جھولتے اپنے ایام گزار رہے ہیں۔ یہ بات کبھی ممکن ہی نہیں ہو سکتی ہے کہ ایک دھوکہ کھا سکتا ہے اور دوسرا نہیں۔ ایک مثال لے لیتے ہیں۔ ایک شخص فریب دے

کر کسی کو اپنا منقوص مال بیچ ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خریدنے والا دھوکے میں آکر ایک بڑے نقصان سے دوچار ہو گیا مگر کیا بیچنے والا مکار فائدے میں ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس نے تو خود بہت بڑا دھوکہ کھایا کیونکہ اس کی عاقبت ہی لٹ گئی۔ خالقِ کائنات کے سیدھے سادے بندوں کو دھوکے میں لانا خدا کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ اس طرح وہ فریب کار قہر الٰہی کو دعوت دے کر خود ایک عظیم نقصان سے دوچار ہو جاتا ہے۔

آج کل کی مادہ پرست دنیا کی بات کی جائے تو دھوکہ دے کر یا دھوکہ کھا کر ہی ایک انسان دو قدم آگے بڑھ سکتا ہے۔ ایک دکاندار صبح تڑکے اپنی دکان کھولنے سے پہلے یہ فکر کرتا ہے کہ دن بھر وہ اپنے گاہکوں کو مرچ کے بدلے پسی ہوئی اینٹیں اور چاول کے بدلے سفید کنکروں کا چورا اونچے داموں کیسے فروخت کرے گا۔ گاہک بھی آنکھیں موند کر اپنی جیبیں اس کی دکان پر خالی کر کے اپنے گھروں کو مطمئن لوٹ جاتے ہیں۔ بھرے بازار میں ہم کوئلہ بیچنے والے کو اکثر تحقیر کا نشانہ بناتے ہیں کہ اس کا کوئلہ معیار کا نہیں ہوتا ہے یا یہ کہ زائد المیعاد ہوتا ہے۔ ایک بار پھر دھوکہ! کوئلہ کانگڑی میں جل جاتا ہے اور جو چیز جلتی ہے گرمی دیتی ہی دیتی ہے پھر اس میں ملاوٹ ڈھونڈنا یا زائد المیعاد والی باتیں کیا معنی رکھتی ہیں؟ جب کہ اسی بازار میں دوا فروش نقلی، غیر معیاری اور اور زائد المیعاد دوائیاں بیچتا ہے مگر اسے کوئی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ دوائیاں تو انسان کی جان بچانے کی خاطر لی جاتی ہیں۔ یہ تو کوئلہ کی طرح کانگڑیوں میں نہیں جلتی ہیں بلکہ انسان کے شریر کے اندر جا کر انسان کو زندگی بخشنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ پھر انسانیت کے ساتھ یہ دھوکہ کیوں؟ پارچہ فروش کی دکان پر جا کر ہم دس بار دیکھتے ہیں کہ جو کپڑا ہم خریدنے جا رہے ہیں وہ کتنا معیار کا ہے یا یہ کہ ہم سے مناسب قیمت لی جا رہی

ہے یا نہیں مگر ایک قصائی مرے ہوئے بھیڑ کی چمڑی اتار کر اسے اپنی دکان پر ٹانک دیتا ہے اور ہم قطار میں کھڑے رہ کر ان متبرک لمحوں کو ترستے رہتے ہیں جب قصائی چند بوٹیاں ہمیں بھی عنایت کر دے۔ ہماری سادگی کی انتہا دیکھیے! جب ہم پیسے دیتے ہیں تو یہ قصائی ہمارے نوٹوں کو آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر یہ دیکھتا ہے کہ نوٹ اصلی ہیں یا نقلی۔

واہ! کتنا حسین دھوکہ! ایک نقلی چیز ہم نے اصلی نوٹوں کے عوض خرید لی اور ہمیں اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہو جاتا ہے کہ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ یہ اور ایسے ہی بے شمار دھوکے انسان اپنے شب و روز میں بس کھائے جا رہا ہے...... کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ اور شاید اس لیے کہ ہم نے بھی اُس گدھے کی طرح اپنی عقل و نظر پر من پسند رنگ کی عینکیں چڑھا رکھیں ہیں۔ جب بھی ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں اور اسے پرکھنے کی سعی کرتے ہیں تو عینک کا رنگ ہمیں ہمیشہ اصلیت سے غافل رکھتا ہے۔ تو پھر کیا؟ جب تک یہ عینک اتر نہ جائے ہم سفید اور کالے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ہم ظلمت اور اجالے کو دو الگ الگ چیزیں ماننے کے لیے تیار نہیں ہونگے۔ اچھا اور برا دونوں ہمارے لیے یکساں ہونگے۔

اس بات میں دو رائے نہیں ہو سکتی ہیں کہ دھوکہ دینے کے پیچھے ایک ہی محرک کارفرما ہوتا ہے اور وہ ہے مال و زر کی لت۔ دولت کمانے کی لالچ میں جہاں ہر خاص و عام دھوکے سے کام لینا ایک فن سمجھتا ہے وہاں سرکار کی نگرانی میں کام کر رہے ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات بھی فریب کاری سے کام لے کر اشتہارات کے ذریعے زیرو کو ہیرو اور زہر کو امرت بنا ڈالتے ہیں۔ پرائیویٹ ٹیوشن سینٹر کی بات ہو یا پرائیویٹ کلنک کی، ریڈکشن سیل کی بات ہو یا کسی پرائیویٹ بنک کا اشتہار ہر بار مفاد عامہ کو بالائے طاق رکھ کر ذرائع ابلاغ لوگوں کو کچھ اس طرح جھانسے میں

لانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جیسے ہمیں سیدھے جنت میں جانے کی سند عطا کی جارہی ہو۔ کوئی پرسش نہیں کہ جس چیز کو وہ چلا چلا کر اعلیٰ خوبیوں والا جتلاتے ہیں وہ کس امتحان یا تجربہ گاہ سے سند حاصل کر کے آئی ہے۔ حالانکہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ یہ سب پیسہ کمانے کے شاطر حربے ہوتے ہیں مگر پھر بھی ہم دولت پرستوں کے اس دام میں آہی جاتے ہیں۔ نہ جانے کیوں؟ شاید اسی لیے کہ زندگی اصل میں ایک دل لبھانے والا دھوکہ ہے جو ہمیں صاف صاف نظر تو آرہا ہے مگر پھر بھی ہم اس کو گلے لگا لیتے ہیں۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ سیاسی میدان کی قلا بازیاں ہوں یا الیکشن کے جھوٹے وعدے، میدان جنگ سے مصنوعی پسپائی ہو یا معاہدوں کی نقلی دستاویزات ہوں، فٹ بال کی ڈربلنگ ہو یا کرکٹ کی گگلی، ہاکی کا اسکوپ ہو یا والی بال کی ڈراپ بال، ہر جگہ اور ہر بار دوسروں کو دھوکے میں لاکر اپنا کام بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح اگر ہم تجربے اور مشاہدات کی بنا پر دھوکہ دہی کی داستانیں لکھنے بیٹھیں تو شاید وہ ہمارے لیے ایک اور دھوکہ ہوگا کیونکہ جو لمحات ہم اس بحث میں صرف کریں گے بہتر اور افضل یہی ہوگا کہ وہ پل ہم اس بات کی تہہ تک جانے میں لگا دیں کہ زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اگر یہ دھوکہ ہے تو اس دھوکے سے کیسے بچا جائے؟ وہ کون سا انمول نسخہ ہے جو ہمیں زندگی کے معانی و مطالب سمجھا سکے؟ سچ مانا جائے تو یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن قطعاً نہیں ہے کیونکہ یہ راز بھی ہمیں اسی زندگی کے شب و روز نے بتا دیا ہے کہ ایسی کوئی گتھی نہیں ہے جس کو سلجھایا نہیں جا سکتا ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ ایسی کوئی شاہ کلید ہاتھ آجائے جو زندگی کے ہر بند تالے کو بس چھوتے ہی کھول سکے۔ ہمارے پاس سنت الٰہی اور سنت رسول ﷺ جیسی شاہ کلیدیں ہیں جن کو اگر ہم زندگی کی حقیقت جاننے کے

لیے استعمال کریں تو ہمارے لیے یہ ایک نئی چیز ہوگی جس میں کوئی دھوکہ ہوگا اور نہ کوئی فریب۔ جب لاکھ پردوں کے اندر چھپی ہوئی چیز کھلی آنکھ سے صاف صاف نظر آئے تو اس کو پہچاننے اور پھر سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی ہے......

......☆☆......

زندگی ......!

حادثات کا گلدستہ

حادثہ کے اصل معنیٰ ہیں کوئی ایسا واقعہ جو اس وقت ہو جائے جب اس کے ہونے کا وہم و گمان بھی نہ ہو۔ حالانکہ عمومی طور پر ہم اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حادثہ ایک غیر متوقع اور غیر ارادی طور پر پہنچنے والا صدمہ ہے جب کہ حادثہ کا مطلب ہے کوئی نئی بات جس کا ادراک حالات ہمیں اچانک کراتے ہیں۔

زندگی حادثات سے بھری پڑی ہے مگر زندگی بجائے خود ایک حادثہ نہیں ہے۔ زندگی ہمیں مختلف قسم کے حادثات کے روبرو کراتی ہے لیکن کوئی حادثہ شاید ہی ہمیں زندگی کے اسرار و رموز بتا سکتا ہے۔ زندگی نہیں تو کوئی حادثہ معنی نہیں رکھتا ہے اور حادثہ نہیں تو زندگی کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ زندگی میں جہاں بے شمار واقعات رونما ہو جاتے ہیں وہاں واقعات کی ایک کثیر تعداد ایسی بھی ہوتی ہے جن کے وقوع پذیر ہونے پر انسان کی کوئی قدرت نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایسے واقعات

ہوتے ہیں جن کے رونما ہو جانے میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ خود بخود انسان کے نہ چاہتے ہوئے بھی پیش آتے ہیں۔انسان کسی کام میں اپنی محنت، دولت اور ہمت جھونک کر اسے پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے لیکن کچھ کام ایسے بھی ہیں جو خود بخود انجام پاتے ہیں چاہیے ان کا نجام اچھا ہو یا برا۔مثلاً ایک شخص اپنے مکان کی تعمیر میں جٹا ہے اور اس کام کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے اسی مکان کی کسی دیوار سے پھسل کر اس کی زندگی انجام کو پہنچتی ہے۔اس کو حادثہ کہتے ہیں۔ مکان بنانا مقصود تھا لیکن بن گیا اس کا مقبرہ۔

اسی طرح کسی دولہے کی بارات سجی ہوئی ہے۔خوشی کے عالم میں ہر کوئی مست ہے۔دولہے کے سر پر سہرا سجا کر بارات نکلتی ہے تو دولہے کے قدم اگرچہ خاک پر ہوتے ہیں مگر اس کا دل چاند پر پہنچ کر ستاروں کے ساتھ اپنی خوشیوں کو بانٹ رہا ہوتا ہے۔ اچانک بجلی کے بوسیدہ کھمبے سے تار ٹوٹ کر دولہے کے سجے سجیلے پیکر پر گر جاتی ہے۔تار میں دوڑتی برقی رو چشم زدن دولہے کی تارِ حیات کو کاٹ کر اسے تاریخ بنا دیتی ہے۔کہاں آنکھوں میں خوابوں کی بارات اور دل میں لاکھوں مچلتے ارمان اور کہاں یہ عالم کہ بدن میں جان بھی باقی نہیں ہے......

جو کام انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی ایسے کسی کام کو انجام تک لینا مطلوب ہوتا ہے لیکن وہ ہو کر رہ جاتا ہے اسی کو حادثہ کہا جاتا ہے۔ حادثات ہر کسی کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہیں۔اس حوالے سے کوئی تمیز نہیں ہے۔بادشاہ ہو یا غلام، زاہد ہو یا رند، امیر ہو یا غریب، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ ہر کسی کی زندگی کسی نہ کسی طرح حادثات سے متاثر ہو جاتی ہے۔ہاں البتہ بڑے لوگوں کے حادثات بھی بڑے ہوتے ہیں جب کہ چھوٹے لوگوں کے حادثات زیادہ دل ہلا دینے والے نہیں ہوتے ہیں۔بڑے لوگوں کی زندگی میں پیسے کی بڑی اہمیت ہوتی

ہے۔بنا بنایا محل اچانک شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا تو ان کی دنیا ہی اجڑ جاتی ہے جب کہ غریب انسانوں کی جونپڑ پٹیاں سال میں تین چار بار جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ملبہ صاف کیا جاتا ہے اور نئی جھونپڑی تیار ہو جاتی ہے۔لیکن جہاں تک انسانی جان ضائع ہو جانے کی بات ہے تو حادثات بڑے ہوں یا چھوٹے دونوں طبقوں کے لوگوں کے لیے یکساں طور پر جگر سوز ہوتے ہیں۔

حادثات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جن کے لیے قدرت ذمہ دار ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن کے لیے خود انسان ذمہ دار ہوتا ہے۔قدرتی حادثات میں زلزلے،سیلاب اور طغیانی،آندھیاں،خشک سالی اور قحط وغیرہ انسانی زندگی کا تہہ وبالا کرنے کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان سارے قدرتی حادثات،جنہیں ہم عرف عام میں ناگہانی آفتیں کہا کرتے ہیں، پر انسان کی کوئی قدرت نہیں ہے۔کب خشک سالی کی وجہ سے قحط کا سامنا کرنا پڑے کوئی نحیف سا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا ہے۔کب لگاتار مینہ برسے اور ندی نالے و دریا لبالب بھر جائیں گے؟ کب اونچی اونچی حویلیوں کے اندر پانی گھس جائے گا اور وہاں کی دیدہ زیب اشیا تنکوں کی طرح بہہ جائیں گیں کوئی علم نہیں رکھتا ہے۔زلزلے کے جھٹکوں سے زمین کب اندر کے راز اگل کر باہر پھینک دے گی اور باہر کی دنیا کو اندر نگل جائے گی کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

وہ حادثات جو انسان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کی وجہ سے رونما ہو جاتے ہیں بھی انسانی زندگی کو جیتے جی جہنم بنا ڈالتے ہیں۔انسان نے ہوا میں اڑان بھری واپس زمین پر نہیں آسکا،سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگایا تو گہرائیوں میں ہی ڈوب کر رہ گیا،نظام ارضیات وفلکیات کے راز جاننے کی کوشش کی تو خود ایک راز بن کر رہ گیا،زمین کا سینہ چیر کر اپنی خوشحالی کے راستے ڈھونڈنے لگا تو اچانک زمین کی

کسی دراڑ میں ہمیشہ کے لیے پھنس کر رہ گیا۔بجلی جیسی محیرالعقل چیز ایجاد کی تا کہ اپنی زندگی کی تاریکیوں میں اجالا کر سکے اور ہوا یوں کہ اسی بجلی نے اس کی زندگی کا چراغ کئی بار گل ہی کر دیا۔

ایک حادثہ ایسا بھی ہوتا ہے جس کے لیے نہ قدرت ذمہ دار ہوتی ہے اور نہ انسان بلکہ ابلیس ایسے حادثات کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔کوئی بندۂ مؤمن اذان سن کر وضو بنا کر مسجد کی جانب بڑھتا ہے تو ابلیس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔مسجد کے عین قریب پہنچ کر یہ بندۂ مؤمن اچانک غفلت میں پڑ کر دنیاوی باتوں میں لگ جاتا ہے اور مسجد کی جماعت اس سے چھوٹ جاتی ہے۔حادثہ،ایک بہت بڑا حادثہ اس کے ساتھ پیش آ گیا۔کوئی شخص برسہا برس محنت کر کے مال و جائداد بنا لیتا ہے اور اچانک اس کا سارا سرمایہ آگ کے شعلوں کی نذر ہو جاتا ہے اور وہ اگلے دن کسی مفلس کی طرح دوسروں کے سامنے اپنا دست سوال دراز کرتا ہے۔بالکل اسی طرح ایک صاحب ایمان عمر بھر خود کو ابلیسی مغالطّوں سے بچا بچا کر تقویٰ کی منزل پا لیتا ہے لیکن اچانک اس کے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں اور وہ حادثے کا شکار ہو کر تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔کیا یہ حادثہ ہر حادثے سے کہیں زیادہ مہلک نہیں ہے؟

حادثات صرف نقصان دہ نہیں ہوا کرتے ہیں بلکہ حادثات سودمند بھی ہو سکتے ہیں۔مثلاً زلزلے جہاں بستیوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیتے ہیں وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانے انہی زلزلوں یا آتش فشان پھٹ جانے سے ہی باہر آ جاتے ہیں۔سیلاب کا پانی اگرچہ ہمارے گھروں کی بنیادوں کو ہلا کر انہیں زمین بوس کر دیتا ہے یہی پانی زمین کی سطح پر اپنی باقیات چھوڑ کر اسے زرخیز بھی بنا دیتا ہے۔مختلف سڑک یا ہوائی حادثات میں جب انسانی

جانیں ضائع ہو جاتی ہیں تو انسانی دماغ کو کچھ نئی سوچنے کی تحریک مل جاتی ہے اور وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انسانی جانوں کے زیاں کو بچانے یا کم سے کم کرنے کی تدابیر دریافت کر لیتا ہے۔

کبھی کبھار حادثے کے ساتھ بھی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ کوئی شخص کسی گہری کھائی میں گر جاتا ہے۔ کھائی کی گہرائی اور تاریکی دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص زندہ سلامت واپس نکلے گا یا نکالا جائے گا۔ لیکن ان ہونی ہو جاتی ہے اور وہ شخص ایک نہیں دو نہیں بلکہ چھ سات دنوں تک موت کی آغوش میں رہ کر موت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی زندگی پا لیتا ہے۔ یا پھر یہ مثال لے لیتے ہیں کہ ایک انسان کو کوئی ایسی بیماری آن پکڑتی ہے جو اسے موت تو نہیں دیتی ہے مگر اس کی شکل وصورت بگاڑ دیتی ہے۔ آخر کار وہ تنگ آ کر کسی جنگل میں پناہ لیتا ہے۔ جنگل کی بے مزہ زندگی بھی اسے اکتا دیتی ہے اور وہ خودکشی کرنے کی سوچتا ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ایک اژدھے کو ایک چھوٹے سے گڑھے میں پانی پیتے دیکھتا ہے۔ بس اس کا کام ہو گیا۔ زہریلے ناگ کا جوٹھا پی کر وہ ایک لمحے میں کرب سے آزاد ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ گڑھے سے اژدھے کا جوٹھا پی لیتا ہے لیکن پھر حادثے کے ساتھ حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ناگ کا زہر اس کے لیے امرت ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے مسخ شدہ چہرے کی رونق لوٹ آتی ہے اور وہ صحت یاب ہو جاتا ہے۔ در اصل اسے جو بیماری لاحق ہو چکی تھی اس کا واحد علاج اژدھے کا زہر تھا جو اس نے موت کو گلے لگانے کی نیت سے پی لیا تھا۔

پھر جب ہم کائنات کی تاریخ دیکھ لیتے ہیں تو یہ بھی محض ایک حادثہ سمجھا جاتا ہے۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کائنات کے مختلف پہلو وجود میں

آ گئے۔تاریخ میں یہ حادثہ Big Bang کے نام سے جانا جاتا ہے۔اور جو واقعہ اس کائنات کا خاتمہ کر دے گا،انسان اپنی کج فہمی کی بنیاد پر اُسے بھی ایک حادثہ ہی سمجھے گا۔یعنی قیامت۔خداوند کریم کا ارشاد ہے:

''اور جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔اور زمین اپنے اندر کے بوجھ باہر پھینک دے گی۔اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا ہے؟......''

(۹۹......۱تا۳)

......☆☆......

زندگی......!

ناکامی کے پھول

ناکامی کا بیج بوکر کامیابی کی فصل کاٹنے کی امید لگائے رکھنا ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑی حماقت ہے۔لہٰذا ہر کوئی چاہتا ہے کہ کامیابی ہر بار اس کا مقدر بن جائے اور فتح ونصرت اس کے قدم چومے مگر یہ ضروری نہیں کہ کامیابی ہر بار ہماری راہ میں پڑی رہے۔خدائی دربار میں بنے ہوئے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔سارے خدائی فیصلے وقتِ مقررہ پر نافذ ہو جاتے ہیں پھر چاہیے اس میں کسی کی کامیابی لکھی ہو یا ناکامی۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ انسان کو اکثر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے جس پر وہ یا تو اپنی تقدیر کو کوستا ہے یا پھر تقدیر ساز کو یا یہ کہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے۔مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہی ناکامی اسے کسی بڑی کامیابی کی نوید سناتی ہے،منزل پانے کے گُر سکھاتی ہے،غموں میں مسکرانے کا سلیقہ سکھاتی ہے،طوفانوں سے الجھ کر جینے کا

حوصلہ ابھارتی ہے اوراس کے ارادوں کو ایک نئی جہت عطا کرتی ہے۔ یہاں کمال سنجیدگی کی ضرورت ہے تا کہ ناکامی کے اسباب کھوج نکالے جائیں اور ان کا سدِ باب کیا جائے۔

جب رائٹ برادرس کو ہوائی جہاز بنانے کی سوجھی تو پلک جھپکنے میں وہ بلند فضاؤں میں محوِ پرواز نہیں ہوئے بلکہ جانوں کا نذرانہ دینے کے بعد ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح کئی بار کی ناکامیوں کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ آج کا انسان بلند فضاؤں میں اڑان بھرتا ہے اور کئی ہزار میلوں کا کٹھن سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے۔ ابرہیم لنکن بار بار کی ناکامیوں کے بعد ہی وقت آنے پر امریکہ کا صدر بن گیا۔ انگریزوں کو ہندوستان کی سر زمین سے کھدیڑنے کی کوشش میں کتنی بار جانثارانِ وطن ناکام و نامراد ہوئے۔ ناکامیوں پر غلبہ پا کر ہی وہ وقت آیا جب فتح و نصرت سرفروشانِ ہند کا مقدر بنی اور انگریزوں کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس وقت کے برسرِ پیکار جانثار اگر مایوسی کا شکار ہو کر اپنے اندر موجزن آزادی کے جذبے کا قتل کر کے اپنی جد و جہد ترک کرتے تو کیا فرنگیوں کے جبر و استبداد سے ہمیں کوئی غیبی طاقت بچانے آتی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کہتے ہیں کہ ناکام وہ نہیں ہے جو میدان میں گر جاتا ہے بلکہ ناکام وہ ہے جو گر کر پھر سے نہ اٹھے۔ یہی گر کر اور خاک چاٹ کر پھر سے اٹھنا کامیابی کا راز مانا جاتا ہے۔

ناکامی کا رونا رونے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ہمیشہ ناکامیوں کے دلدل میں پھنسے رہیں گے اور مایوسیوں کے بادل ہم پر اس قدر چھا جائیں گے کہ کامیابی و کامرانی کے جگمگ سورج کی ضوفشانی ہمارے لیے بے معنیٰ بن جائے گی۔ قرآنِ پاک میں بھی بارہا مقامات پر مایوسی سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ناکامی کے بعد

مایوس نہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ نفع یا نقصان، جیت یا ہار، خیر یا شر سب اللہ کی مرضی ہے۔ جب ہم کامیاب ہونے پر جشن مناتے ہیں تو ہم بھول جاتے ہیں کہ خوشی کے یہ پل کس اعلیٰ و ارفع ذات کے عنایت کردہ ہیں اور پھر فتح و نصرت پر شادمانی کا اظہار کرنا انسان کی فطرت ہے مگر ناکامی پر مایوس ہوکر واویلا کرنا، ماتم کرنا، منہ لٹکائے رہنا یا دیوانوں کی سی صورت بنانا کہاں کی دانشمندی یا صاحبِ ایمان ہونے کا اظہار ہے۔ کامیابی ملنے پر ہم خوب اترا کر کہتے ہیں کہ سب ہماری محنت کا نتیجہ ہے اور جب کبھی ناکامی کا کالا دیو ہمارے در و دیوار پھلانگ کر آتا ہے تو ہم تقدیر کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں کتراتے ہیں۔ اُس وقت ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ ناکامی میری کوتاہیوں اور نااہلیت کا نتیجہ ہے۔

اصل میں جو لوگ سمندری لہروں کا سامنا کیے بغیر ساحل پر آتے ہیں انہیں سمندر کی گہرائیوں میں پنہاں مچلتے طوفانوں اور ساحل کے بیچ کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا ہے۔ ان کی زندگی میں وہ کشش اور چاشنی نہیں ہوتی ہے جو کشمکش بھری زندگی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے برعکس طوفانی لہروں سے لڑ کر ساحل پر پہنچنے والوں کو ساحل بہت پیارے لگتے ہیں۔ ساحل پر کھڑے ہوکر انہیں علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہیں تجھے اونچا اڑانے کے لیے

ٹھوکریں کھا کر ہی انسان سنبھل کر چلنا سیکھتا ہے۔ جب تک سرمہ پس پس کر دھول نہ بن جائے وہ انسان کی آنکھ کی زینت بن کر کامیابی نہیں پا سکتا ہے۔ خوشبو کا پھول سے جدا ہوکر ہوا میں تحلیل ہو نا ہی پھول اور خوشبو دونوں کی

کامیابی ہے۔فرض کریں خوشبو پھول سے الگ ہو کر بکھر نہ جائے تو اسے اس دعوے سے دستبردار ہونا پڑے گا کہ وہ ہمارے دل و دماغ کو معطر کر سکتی ہے۔

سبھی ماہرینِ نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ کئی ناکامیوں کے بعد انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں پھر اس کے لیے ناکامی کے مواقع نہ ہونے کے برابر رہتے ہیں۔لٰہذا کامیابی کا مطلب کامیابی نہیں بلکہ کامیابی کا مطلب ہے ناکامی کے بعد کا مقام۔حضرت آدم خلد میں ناکام ہوا۔ناکامی کے بعد دنیا میں جی کر اس نے ابلیس کو شکست فاش دے کر جو مقام حاصل کیا وہی اس کی اصل کامیابی ہے۔حضورِ پُر نور ﷺ مکہ میں بظاہر ناکام ہو کر مدینہ کی فضاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے مگر اس وقتی ناکامی کی آغوش میں فتح و نصرت کے جو گُل کھلے ان کی مسحور کن مہک کی بدولت کائنات کا کونہ کونہ آج بھی مہک رہا ہے۔اگر شعب ابی طالب کی اسیری کا اندوہناک دور دیکھ کر محمد ﷺ کے وہ دیوانے حوصلہ ہار بیٹھتے تو کیسر و کسریٰ کے بت خانوں کو تاراج کر کے کامیابی کے جھنڈے گاڑنا ان کا مقدر نہیں بن جاتا۔حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ کامیابی ملے یا ناکامی نصیب ہو ہر حال میں ہمیں خداوند کریم کا مشکور و ممنون رہنا چاہیے۔کامیابی ملے تو کامیابی ہے اور اگر ناکامی ہاتھ آئے تو یہی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کسی ابدی کامیابی کی نوید ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

علم کا نور

انسان انسان ہے اس بات کا پتہ ہمیں تب چلتا ہے جب ہم کسی حیوان یا درندے کو اس کے اصل روپ میں دیکھتے ہیں۔انسان اشرف المخلوقات ہے مگر غلطیوں کا پتلا بھی تو ہے۔کب کہاں اور کیسے کوئی غلطی کر بیٹھے اس کا اسے خود کو بھی علم نہیں ہوتا ہے۔اس طرح اس کا رویہ یا وطیرہ ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔وہ کبھی بچہ جیسا معصوم لگتا ہے تو کبھی پیشہ ورانہ ظالم۔کبھی زاہد دکھتا ہے تو کبھی رند۔کبھی ظالم و جابر تو کبھی عاجز و مجبور۔کبھی حاکم کی طرح اکڑا ہوا تو کبھی محکوم کی طرح سر جھکائے۔بنیادی طور پر بچہ جب جنم لیتا ہے تو وہ کچھ نہ ہو کر بھی سب کچھ ہوتا ہے۔سب کچھ اس کے وجود کے اندر موجود ہوتا ہے۔عالمِ باطن کی جس چیز کے بارے میں وہ جان جاتا ہے وہ اسے عملاً کر پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔بچپن کے وہ معصوم پل ہی اسے آنے والی زندگی کے طور طریقے سکھاتے ہیں۔لہٰذا یہ بات لازمی بن

جاتی ہے کہ بچے کو اس کے اندر کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کی بھرپور جانکاری ہو اور جو چیز اس کی قابلیت اور صلاحیتوں کو آشکارا کر کے اس کے سامنے رکھ دیتی ہے اسے تعلیم کہتے ہیں۔ تعلیم سے انسان کے متضاد رویے میں ایک خوش نما توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر انسان انسان نہیں بلکہ حیوان سے بھی گئی گزری مخلوق لگتی ہے۔ وحشی پن سے نجات پانے کے لیے، برائیوں سے پاک وصاف رہنے کے لیے اور انسانیت کی خلعت زیب تن کرنے کے لیے انسان کو تعلیم جیسے بیش بہا زیور سے آراستہ کرنا ہوتا ہے۔ علم کا نور ہی اس کے اندر کی تاریکی کو مٹا سکتا ہے اور اس کے اندر یہ احساس اجاگر کر دیتا ہے کہ زندگی کا ایک خاص مقصد ہے۔ چنانچہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل جیسی نعمت سے نواز کر دوسری مخلوقات سے ممیّز کر دیا ہے تو اس نے اللہ کی عطا کردہ اس نعمت کا بھرپور استحصال کیا۔ عقل کے بل بوتے پر اس نے تعلیم کے حصول کو بھی ایک نئی جہت دیدی اور بڑی عیاری کے ساتھ اسے انسانیت کے گر سیکھنے سکھانے کے بجائے دولت کمانے کا ایک خوبصورت ذریعہ بنا دیا ہے۔

حصول تعلیم کے نام پر بظاہر ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ سکول، کالج اور دیگر بڑی بڑی دانش گاہیں گاؤں گاؤں نظر آتی ہیں جو کہ آج سے محض تیس یا چالیس سال پہلے ایک خواب تھا۔ اعلیٰ ڈگریوں کی اسناد اس طرح بانٹی جا رہی ہیں جس طرح سیلاب زدگانوں میں ریلیف۔ اس طرح پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہو رہا ہے۔ آج ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ علم کے نور سے ہم نے اپنے گھر کا کونہ کونہ روشن کر رکھا ہے۔ ہم نے اپنے گرد و پیش کے ہر دو راہے پر علم کی شمع روشن کر رکھی ہے مگر افسوس کہ علم کی نورانی کرنیں ہمارے من کی تاریکیوں میں اجالا نہیں کر سکی ہیں۔ ہمارے من کی دنیا میں اس قدر تیرگی چھائی ہوئی ہے کہ ہمیں وہاں کی کوئی چیز نظر نہیں آتی ہے۔ ہم نہ کھلی آنکھوں سے ادھر کی کوئی چیز دیکھ

پاتے ہیں اور نہ ہاتھ پاؤں سے ٹٹول کر کچھ محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمارے من کی دنیا میں جگہ جگہ عریاں تصویریں منقش ہیں۔ وہاں خود غرضی، لالچ، بے ایمانی اور خود فریبی جیسی غلاظتوں کے ڈھیر قدم قدم پر نظر آرہے ہیں۔ شیطانیت کے مکڑوں نے جالے تن رکھے ہیں۔ گدھ اور چیل کوؤں کی پھڑ پھڑاہٹ ہماری باطن فضاؤں میں ایک خوفناک ماحول بپا کر دیتی ہے۔ یہ ہمارے اندر کے عالم کا وہ پراگندہ ماحول ہے جس کو ہم علم کی دولت سے مالا مال ہو کر بھی پاکیزہ نہیں بنا سکے ہیں۔ اُلٹا ہم یہ کرتے ہیں کہ اپنے اندر کی بدبو اور سڑاند کو ہم دلفریب اور پیچدار گفتگوؤں سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

ہم علم کے مقدس نور سے کس قدر محروم ہیں کہ ہم خوش وضع ہیں مگر خوش اخلاق نہیں۔ ہم بیک وقت چار پانچ زبانیں بول سکتے ہیں مگر اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو جاتے ہیں۔ ہم اعلیٰ عہدوں پر فائض ہیں مگر ہماری شخصیت ادنیٰ درجے کی ہے۔ ہماری شخصیت نکھری ستھری اور پر کشش نہیں ہے۔ ہمارے منہ سے شیریں بول نہیں نکلتے۔ بات کرتے ہیں تو سنجیدہ طبیعت انسان روح میں ایک چبھن سی محسوس کرتا ہے۔ ہماری باتوں میں وہ گہرائی، بالغ پن یا سنجیدگی نظر نہیں آتی جو ہماری بردباری کی وکالت کرتی۔ ہمارا کردار مشکوک اور ہمارا وطیرہ وحشی نظر آتا ہے۔ ہماری سوچ تخریبی اور ہماری فکر پراگندہ ہے۔ ہمارا فہم و ادراک معذور ہے۔ ہماری خودی پامال ہے۔ ہمارے اندر غیرت مفقود ہے۔ ہمارا ضمیر مردہ ہے یہی آج کے اس نام نہاد مہذب دور میں ہماری پہچان ہے۔ بقول اقبالؒ ؎

اہل دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

اصل میں ہماری زندگی کی بنیاد ہی کج ہے۔ظاہر ہے کہ ٹیڑھی میڑھی بنیاد پر تعمیر کی گئی عمارت کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی ہے۔یہی ٹیڑھا پن ہمارے سیرت و کردار سے عمر بھر جھلکتا رہتا ہے۔علم کے نام پر ہم اپنے لیے یا اپنے بچوں کے لیے جو بندوبست کرتے ہیں وہ صریحاً ناقص ہوتا ہے۔ہماری ترجیحات مادی ہوتی ہیں روحانی نہیں۔پیسہ ہمارا امام ہوتا ہے۔ہم ایامِ شیر خواری سے ہی اپنے نونہالوں کو یہ تعویذ پلاتے ہیں کہ انہیں ڈاکٹر بننا ہے یا پھر انجینئر یا ایسا کچھ بھی جو پیسہ اُگلتا ہو اور ہم انہیں ابتدا سے ہی اسی سانچے میں ڈالنے کی سنجیدہ کوششیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ان کے اندر ڈاکٹر یا انجینئر موجود ہو یا نہ ہو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اپنے ننھے منوں کو ان کے فطری رجحانات سے موڑ کر اپنی من پسند خواہشات کی تکمیل کا ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔انہیں ہم وہی بنانا چاہتے ہیں جس کا معاشرے میں چلن ہوتا ہے یا پھر یہ کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں ہم بھی گھوڑ دوڑ میں شریک ہو جاتے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ ہمارا گھوڑا کتنا پھرتیلا ہے اور ہم خود کتنے ماہر گھوڑ سوار ہیں۔یہاں پر ہم اس حقیقت کو اپنے حلق سے نیچے اتارنے پر تیار نہیں ہوتے ہیں کہ پائلاٹ کی وردی پہننے سے ٹرک ڈرائیور جہاز نہیں اڑا سکتا۔

ہمارے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کی الگ الگ صورتیں ہیں اور ہر انگلی کا اپنا منفرد کام ہے۔جو کام ہم اپنی چھوٹی انگلی سے کر سکتے ہیں وہ موٹے انگوٹھے کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر پانچوں انگلیاں ایک ساتھ مل کر ہاتھ بناتی ہیں اور جو کام ہاتھ انجام دیتا ہے وہ انگلیاں انفرادی طور پر نہیں کر سکتیں۔بالکل اسی طرح معاشرے میں ہر فرد کا الگ الگ کام ہوتا ہے اور اسی پس منظر میں ہر انسان منفرد صلاحیتوں کے ساتھ جنم لیتا ہے۔بعد میں علم کے ذریعے اُس کے اندر ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا موجود خزانہ اس کے سامنے کھول کے رکھ دیا جاتا ہے۔فرسودہ

رسم و رواج سے آنکھیں مونڈ کر والدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کے عین مطابق ذہنی اور جسمانی نشو نما کریں۔اس بات سے قطعی لاتعلق ہو کر کہ کون کیا بنتا یا بنایا جاتا ہے انہیں یہ کھوجنا چاہیے کہ ان کے بچے کے اندر کونسا انسان چھپا ہے نہ کہ بھیڑ چال چل کر بچے کے ودیعتی کمالات کو اپنے نام نہاد سماجی رتبے کی بھینٹ چڑھا دیں۔

ہم اپنی زندگی میں اولاد کو کیوں صرف ڈاکٹر یا انجینئر کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں جب کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر بچہ ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن سکتا ہے۔ہمیں اس کی لت محض اس لیے پڑی ہے کہ ان پیشوں میں زر کثیر کمانے کے آسان مواقع موجود ہیں۔ظاہر ہے کہ وہ حلال ہوں یا حرام اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔جب ہمارے پاس دولت ہو تو شہرت آ ہی جاتی ہے اور جب شہرت آ گئی تو سماج میں ہمارا ایک رتبہ بن جاتا ہے اور لوگ ہمیں قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔یوں ہم نادانی میں یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔

یہ ایک نا معقول ضد ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو قلم شعر اگلنے یا مضامین تحریر کرنے کے لیے بنا ہوتا ہے وہ ڈاکٹر بن کے مریضوں کا علاج کرنے کے بجائے اُن کو فلسفیانہ باتوں میں الجھا دیتا ہے۔جو ایک مثالی استاد ہو سکتا تھا وہ کسی آپریشن تھیٹر میں قینچی اور گاز لے کر انسانی جان بچانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔جو ہاتھ انتظامی امور چلانے میں کرشمے دکھاتا وہ کسی شفا خانے میں ہاؤس جاب کر رہا ہے۔جو دماغ فلسفیانہ تحقیق کے لیے موزون تھا وہ کہیں پر پل تعمیر کرنے میں جتا ہے۔جو شخص تجارت میں نام کما کر ہمارے معاشرے کا رتن ٹاٹا بن جاتا وہ کسی تعمیراتی منصوبے پر اپنا مغز کھپا رہا ہے۔جو شخص فوجی وردی پہن کر

سرحدوں پر دشمن کے دانت کھٹے کر دینے کی بے انتہا صلاحیت رکھتا ہے وہ سفید ایرن پہن کر کسی میڈیکل کالج کے کلاس روم میں اونگھ رہا ہے۔ جو شخص جہاز کو آسمان کی بلندیوں میں اڑانے کا شوق رکھتا ہے وہ بچپن میں پلاسٹک کے کھلونی جہاز چلاتا ہے مگر افسوس جب وہ جہاز چلانے کی عمر پا لیتا ہے تو ہم اسے کسی کثیر منزلہ عمارت کا نقشہ تیار کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ جو بچہ چھڑی ہاتھ میں لے کر اپنے ممی پاپا کو کھڑا کر کے توتلی زبان میں 'الف شے انال' پڑھاتا ہے یا انہیں ایک منجھے ہوئے استاد کی طرح ڈانٹ پلاتے ہوئے کہتا ہے 'چپ لہو، اچھے بچے شول نہیں کلتے' وہ کل کسی تھانے کا افسر ہوتا ہے۔ کہاں استاد کا ایثار و ہمدردی بھرا دل اور کہاں پولیس افسر کی تُرش روئی۔ کیا حد ہے خود غرضی کی؟

ماں کی کوکھ سے جنم لینے والا ہر بچہ فطرت کے تقاضوں کے تحت ایک معاشرے کے لیے خاص قسم کی سوغات لے کر آتا ہے۔ اگر قدرت نے ہمارے گھر ایک بہترین سپاہی بھیج دیا تو ہم کیوں اسے خاکی کے بجائے سفید ایرن پہنانا چاہتے ہیں؟ قدرت کا نظام ہی ایسا ہے کہ اس نے کسی کے سر کالی ٹوپی رکھی تو کسی کے سر سنہری تاج۔ اپنی لالچ اور خود غرضی کی وجہ سے ہم اس نظام کو لاکھ کوششوں کے باوجود بدل نہیں سکتے ہیں۔ ہم ایک محبّ وطن کانسٹیبل کو رشوت یا سفارش کے بل پر کسی میڈیکل کالج میں داخلہ دلا تو سکتے ہیں مگر اسے کبھی دردِ دل رکھنے والا ڈاکٹر نہیں بنا سکتے۔ جب بھی ہم فطرت کے خلاف محاذ کھولنے کی نادان کوششیں کریں گے ہماری زندگی ہمارے لیے محض ایک بوجھ بن جائے گی۔

......☆☆......

زندگی......!

غم کی سیج

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرسکتا ہے کہ انسان دنیا میں آنکھ کھولتے ہی رونا شروع کر دیتا ہے۔ انسانی تاریخ میں آج تک ایسی کوئی مثال ہی نہیں ہے کہ کسی انسان نے ماں کی کوکھ سے جنم لیتے ہی مسکرایا ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ کوئی فطری عمل ہے یا پھر اس بظاہر چھوٹے سے واقعے میں کوئی بڑا فلسفہ چھپا ہے۔ بزرگوں اور اہلِ دانش کے بقول جنم لیتے وقت جو بچہ جتنا چلّا چلّا کر روتا ہے وہ اتنا ہی ذہین اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ جنم لینے والا بچہ رو رو کر خود کا برا حال کر دیتا ہے جب کہ اس کے برعکس اس کے والدین اور دوسرے چاہنے والے مسکراہٹوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی تکلیف کی وجہ سے روتا تو اس کے چاہنے والوں کو اُس کی تکلیف کو محسوس کر کے فکرمند ہونا چاہیے تھا۔ الٹا یہ ہوتا ہے کہ آس پاس کے لوگ خوشیاں بانٹتے ہیں اور مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔ بچہ روتا کیوں ہے؟ کیا وہ

اپنی آنے والی زندگی کی ہزیمتوں اور مصیبتوں کو جنم لیتے ہی بھانپ لیتا ہے اور رونا شروع کر دیتا ہے؟ کیا وہ اپنی ماں کے بطن سے آزادی پاتے ہی اس سوچ کا غلام بن جاتا ہے کہ وہ جس زندگی کو جینے کی شروعات کر چکا ہے وہ اُسے کسی دلہن کی طرح سجی سجائی ملنے والی نہیں ہے؟

کیا اپنی ماں کی اندھیری کوکھ سے جنم لیتے ہی اُس پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ زندگی جینے کے لیے اُسے جس راستے پر چلنا ہے وہ دکھ اور آزمائش کے کانٹوں سے سجا ہے؟ کیا زندگی کی پہلی سانس اُسے یہ پیغام دیتی ہے کہ اپنے اپنوں کی اس بھیڑ میں وہ تنہا جنا ہے، تنہا اسے جینا ہے اور تنہا مرنا ہے؟ کیا اپنی ماں کی بانہوں کا جھولا جھولتے جھولتے وہ یہ اخذ کر لیتا ہے کہ اُس پر محبتوں کے پھول نچھاور کرنے والی ماں اور پدرانہ شفقت کے جام پلانے والے باپ کے علاوہ غم نام کی بھی کوئی چیز ہے جس کا سہارا اسے عمر بھر لینا پڑے گا؟

ایسے ہی بے شمار سوالوں کے جوابات میں الجھ کر بچہ بس روئے جاتا ہے یہاں تک کہ تھک ہار کر خاموش پڑ جاتا ہے اور پھر جب اُسے اپنی ماں کی چھاتی کا دودھ پلایا جاتا ہے تو وہ سارے غم بھول جاتا ہے۔ وہ ایک نئے انداز سے جینا شروع کر دیتا ہے جس میں ملن کی خوشیاں ہوتی ہیں، محبتوں کے نغمے ہوتے ہیں، رشتوں کے بندھن ہوتے ہیں، دوستی کے مچلتے جھرنے ہوتے ہیں، سہانی یادوں کی گنگناتی ندیاں ہوتی ہیں اور خلوص اور سادگی کے بہتے چشمے ہوتے ہیں۔ جوانی کی سیڑھیاں چڑھتا یہ بچہ ایک ایسی زندگی سے آشنا ہو جاتا ہے جس میں جدائی کا غم ہوتا ہے، نفرتوں کے وار ہوتے ہیں، رشتے نبھانے کی اُلجھنیں ہوتی ہیں، تلخ یادوں کے بہتے دریا ہوتے ہیں، دشمنی کے لپکتے شعلے ہوتے ہیں اور مکر و فریب کی بھول بھلیاں ہوتی ہیں لیکن زندگی کے زینے وہ ایسے ہی طے کرتا جاتا ہے۔ دیکھتے

دیکھتے وہ برس ہا برس جی لیتا ہے اور برسوں پر محیط اس کی زندگی کے نشیب و فراز میں غموں کے بے شمار ان مٹ نشانات اس کی زندگی کی کہانی کے راوی بن کر موجود ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ غموں کے دوش پر ہی راحتوں کے قافلے اپنے پیاروں کو تلاش کرتے ہیں۔ جس طرح طوفانی بارشیں تھم جانے کے بعد ایک مسحور کن ہریالی چھا جاتی ہے بالکل اسی طرح غموں کی بارشیں تھمتے تھمتے ہمارے قدموں میں مسرت اور شادمانیوں کی وہ سوغات چھوڑ جاتی ہیں جو ہمارے سوختہ ارمانوں میں ایک نئی جان پھونک دیتی ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو غم غم نہیں رہتا ہے بلکہ یہ وہ دردِ زہ ہے جسے جھیلنے کے بعد ہی ایک عام سی عورت کو ماں جیسا حسین اور میٹھا نام مل جاتا ہے۔ غم بھی وہ حسین تکلیف ہے جس سے گزر کر ہم خوشی کا انمول خزانہ پا لیتے ہیں۔ اب یہ انسان کی سوچ پر منحصر ہے کہ وہ غم کو غم مان کر زندگی کی جنگ لڑنے سے پہلے ہی جا کر ہار کی گود میں بیٹھتا ہے یا پھر غم کو اپنا مسیحا مان کر اس کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں غوطہ زن ہو کر زندگی جینے کے اُس انمول موتی کو ڈھونڈ کر لائے جو صرف ان لوگوں کے ہاتھ لگ جاتا ہے جو عقل سے نہیں بلکہ جنون سے کام لیتے ہیں۔

......☆☆......

زندگی......!

ماٹی کے مول

ہر آغاز کا انجام ہوتا ہے۔ ہر ابتداء انتہا کو پہنچتی ہے۔ بات شروع ہو جاتی ہے تو ایک ہی سانس میں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ سورج صبح سویرے بڑی آن بان کے ساتھ مشرقی افق پر ظہور پذیر ہو جاتا ہے اور دیکھتے دیکھتے سارے حشرات الارض پر اپنی پُر جلال حکومت قائم کر لیتا ہے لیکن جلد ہی اس تیزابی کرنوں والے سورج کے غروب ہوجانے کا وقت آن پہنچتا ہے۔ وہ اونچے پہاڑوں کی اوٹ میں کچھ اس طرح اپنا دم توڑ دیتا ہے کہ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ بہر حال ہر کہانی نقطۂ عروج پر پہنچ کر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر بیتی کہانی اپنے پیچھے نصیحت کے انمول موتی چھوڑ جاتی ہے۔ یہ ہمارے لیے لازم بن جاتا ہے کہ اُن انمول موتیوں کو چُن کر ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھیں۔

جب یہ کائنات وجود میں آگئی تو اس کی ہیّت کچھ اور تھی۔انسان کا رہن سہن اور اس کے عادات و اطوار غیر مہذّب تھے۔آج دیکھیں تو کائنات کی وہ پرانی کہانی تو محض تاریخ بن کر رہ چکی ہے۔لیکن ماضی کی اسی غیر مہذب کہانی کے پس منظر میں انسان ترقی کی بلندیوں کو چھو گیا۔لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہر کمال کے بعد جو زوال آتا ہے دراصل وہ زوال ایک نئے پُر شکوہ کمال کی ابتدا ہوتی ہے۔بقول احمد ندیم قاسمی ؎

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

انسان جب ہوش سنبھالتا ہے تو اسے زندگی جینے میں کچھ الگ ہی چاشنی محسوس ہوجاتی ہے۔زندگی کے مختلف پہلو اس کے سامنے اجاگر ہو جاتے ہیں اور زندگی کی قوسِ قزح کے سارے خوش نما رنگ اس کے دل و دماغ میں سما جاتے ہیں آہستہ آہستہ وہ ایک منجھے ہوئے تنومند جوان کا روپ دھار لیتا ہے۔یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں انسان کو اُس چھپی حقیقت کو دریافت کر لینا ہوتا ہے جو بہت کم لوگوں کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔زندگی کے اس دور میں چونکہ انسان صحت مند ہوتا ہے،پُر مغز ہوتا ہے،پُر شکوہ ہوتا ہے،پُر کشش شخصیت کا مالک ہوتا ہے،اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے،خوشیاں اُس کی غلام ہوتی ہیں اور وہ بظاہر ہر چیز پر قادر ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنا سیاق وسباق بھول جاتا ہے۔وہ بھول جاتا ہے کہ یہ زندگی مستعار ہے۔ یہ ایک پھولے ہوئے غبارے کی مانند ہے جو اس کے اندر بھری گئی ہوا کے بل بوتے پر فضاؤں میں اڑ رہا ہے لیکن یہ ہوا جو اس کے وجود کے اندر کسی اور نے بھری ہوئی ہے کسی بھی وقت نکل کر اس کا وجود خاک میں مل سکتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی پیدائش ہوتے ہی موت اس کے نقشِ قدم ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس

کے تعاقب میں ہے۔تاریخ کے صفحوں میں سکندرِ اعظم کہلایا جانے ولا شخص دنیا کو تسخیر کرنے کا خواب لے کر فاتحانہ انداز میں پیش قدمی کر رہا تھا کہ مست جوانی میں وہ تاریخ بن گیا۔ جرمنی کے مشہور نازی لیڈر ہٹلر نے اپنی زندگی کے ایّام مستی میں اپنے انسانی تشخص پر وہ خوفناک قبا اوڑلی کہ موت بھی انگشت بدندان تھی لیکن اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے دنیا کے لیے ایک قابلِ غور مثال بن گیا۔

حاصلِ گفتگو یہی ہے کہ دنیا میں آئے ہیں تو یہاں سے جانا بھی ہے۔ جانا ہے اور ہر حال میں جانا ہے۔لیکن ہم جانے کے بعد بھی دنیا کو اپنی موجودگی کا احساس دلا سکتے ہیں، محفلوں میں شریک ہو سکتے ہیں اور اپنی بات منوا سکتے ہیں۔وہ ایسے کہ ہم اپنی زندگی کے دورانیہ میں خود کو فنا کر کے دوسروں کے آرام و آسائش کی خاطر کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیں جس کی بدولت لوگ ہمیں رہتی دنیا تک یاد کرتے رہیں۔ جس شخص نے اپنی زندگی کا سنہری دور محض کھانے ، پینے اور عیش کوشی میں گنوا دیا وہ اپنی آخری سانس لینے کے ساتھ ہی صفحہ ہستی سے گم ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی محض مٹی کے مول بک جاتی ہے۔دوسری طرف جو لوگ اپنے ایّام عروج میں محنت شاقّہ کر کے اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں لوگ ہر حال میں انہیں یاد کرتے رہتے ہیں۔ انہی لوگوں کی زندگی انمول ہوتی ہے اور موت قابل رشک ہوتی ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

خود غرضی کا گرداب

انسان کی تخلیق میں خالق کائنات کے رنگوں کی قوسِ قزح نظر آتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ زندگی کی دوڑ میں شامل ہیں لیکن کسی ایک کی بھی کسی دوسرے کے ساتھ شکل ملتی ہے اور نہ عقل۔ ہر ایک کی ذہنی صلاحیتیں جدا ہیں، اٹھنے بیٹھنے کے اطوار الگ الگ ہیں، اندازِ بیان الگ ہے، اندازِ تدبّر و تفکّر الگ الگ ہے اور اخلاق و کردار جداگانہ ہیں۔ کسی کو میٹھا پسند ہے تو کسی کو کھٹا۔ کوئی کم خور و کم گو ہے تو کوئی کھا کے بھی بھوکا ہے اور بول بول کے بھی تھکتا نہیں ہے۔ کوئی رحم دل ہے تو کوئی سنگ دل۔ اسی طرح اگر ہم انسان اور انسان کی پسند اور ناپسند کو شمار کرنے کی کوشش کریں گے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ دراصل انسانوں کے اندر پسند اور ناپسند کا تضاد ایک فطری عمل ہے اور اسی تضاد کی بنیاد پر انسانی زندگی میں ایک بہت ہی ناپسندیدہ چیز پروان چڑھ گئی جسے ہم خود غرضی کہہ سکتے ہیں۔ خود

غرضی کا مطلب نفس پروری ہے۔ خصوصی طور پر ہر حال میں اپنا یا اپنے فائدے کا خیال رکھنا خودغرضی ہے۔ خودغرض لوگ مطلب پرست ہوتے ہیں۔ مشاہدے کے بل بوتے پر ہم یہ دوٹوک الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں جو خودغرضی کے دائرے سے باہر رہ کر زندگی جی لیتے ہیں جب کہ خودغرضی اور انا پرستی کی قبائیں اوڑھے لوگوں کی بھیڑ زندگی کے ہر دوراہے چوراہے پر نظر آتی ہے۔ پھر جو لوگ ایوانِ حکومت میں پہنچ جاتے ہیں ان میں سے بیشتر لوگ اسی بھیڑ سے نکل کر آتے ہیں۔

کبھی کسی اہم نقطے پر بحث و تمحیص ہوتی ہے یا کسی خاص اُلجھن کا سلجھانا مقصود ہوتا ہے تو انسانی فطرت آڑے آجاتی ہے۔ انسانوں کی جدا جدا پسند اور نا پسند کوئی متفقہ اور ہر دل پسند لائحہ عمل مرتب کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ جتنے لوگ اتنے حل سامنے آجاتے ہیں۔ الگ الگ آرائیں پیش کی جاتی ہیں۔ کوئی اپنی تجویز سامنے رکھتا ہے تو پھر اس کی تعریفیں بھی خود ہی کرنے لگتا ہے۔ دوسری کوئی رائے ابھرتی ہے تو اسکا پوسٹ مارٹم کر کے اس کی تمام ممکنہ نقصانات کو چن چن کر ابھارا جاتا ہے۔ اپنی رائے زرّیں قول اور دوسروں کی رائے قولِ فضول۔

کچھ اسی طرح ملکی قوانین بھی ترتیب پاتے ہیں۔ مذہب اور آئین کو بالائے طاق رکھ کر ان کے نام پر انسان خودغرضی کے مہلک ہتھیار سے ایسے قوانین گڑھ لیتا ہے کہ انسانیت کا دم گھٹ جاتا ہے۔ ملک میں قانون کے نام پر ایک ایسے دستور کا چلن عام ہو جاتا ہے کہ غریبوں کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ بے بسوں کی زندگی ان کے لیے مانو جہنم کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ عدل و انصاف کی کوکھ سے ظلم و بربریّت کی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ حقداروں کا حق چھن جاتا ہے اور مظلوموں کو موت کو گلے لگانا سب سے آسان اور آرام دہ لگتا ہے۔ یہ صورت حال ہر جگہ

پائی جاتی ہے۔ ملک کا بادشاہ ہو یا شہر کا کوتوال، گاؤں کا سردار ہو یا کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کا سربراہ، کسی ٹیم کا کپتان ہو یا کسی فوج کا کمانڈر ہر جگہ انسان معاملات کو اپنی غرض کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور پرکھتا ہے اور پھر جو کچھ اسے محسوس ہو جاتا ہے اسی احساس کی بنیاد پر وہ فیصلے بھی سناتا ہے۔ اُس کا تجزیہ اور تجزیے کے پس منظر میں لیا گیا فیصلہ صحیح ہے یا غلط اس کے لیے کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ہے کیونکہ ہر خود غرض انسان کو اپنی بات پکی لگتی ہے، اپنی عقل عقلِ سلیم لگتی ہے، اپنا تجربہ وسیع لگتا ہے چاہے وہ کم سِن ہی کیوں نہ ہو اور بس اپنی سوچ زاہدانہ لگتی ہے۔

ویسے انسان دو بنیادی وجوہات پر خود غرض بن جاتا ہے۔ یا تو وہ بے حد لالچی ہوتا ہے یا پھر انانیت کا شکار ہوتا ہے۔ لالچی انسان ہر بہتی ندی کا رخ اپنے آنگن کی طرف موڑنے کو کوشش میں لگا رہتا ہے کیوں کہ اُس کی کبھی پیاس بجھتی ہے اور نہ کبھی اُس کی بھوک مٹتی ہے۔ اسی طرح انانیت کا شکار انسان 'من ہستم' کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی انا کو ذرا سی ٹھیس کیا پہنچتی ہے دنیا کا تہہ و بالا کرنے پر اتر آتا ہے۔ مذہبی اصولوں کی دھجیاں اڑا دیتا ہے اور اس کے قوانین کو اپنے من کی درخواست کے عین مطابق خلط ملط کر کے پیش کرتا ہے۔

ہمارے پیغمبر آخر الزماں ﷺ جب نبوت کا اعلان کر کے عرب دنیا کے منظر عام پر جلوہ گر ہوئے تو کونسی لالچ تھی جس کی انہیں پیش کش نہ کی گئی۔ دنیا کی کونسی نعمت تھی جو ان کے قدموں نہ رکھی گئی۔ بدلے میں یہ مانگا گیا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہ کہیں اور ایسا کچھ نہ کریں جو کہ بقول عرب لوگوں کے اُن کے آبا و اجداد کے طور طریقوں کے خلاف تھا۔ لیکن اُس ساری کہانی میں خود غرضی یا لالچ مطلوب نہیں تھی۔ مطلوب تھی تو لوگوں کی بھلائی اور خیر خواہی۔ یہاں ہمارے پیارے رسول ﷺ کہاں جھکنے والے تھے۔ بس اپنے مقدس مشن کے ساتھ مگن رہے چاہے

طائف کی اذیتیں سہنی پڑیں یا پھر شعب ابی طالب کی صعوبتیں۔ بس ہر دوراہے ہر چوراہے پر خلوص و ایثار کے چراغ روشن کرتے رہے جس کے ردِّ عمل میں ظلم و بربریت کی ایک ایسی دستان رقم ہوگئی کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں ہجرت کرنی پڑی۔ انجام کار حضور ﷺ فاتح بن کر واپس مکہ میں داخل ہوئے لیکن وہ اُن لوگوں پر پھر بھی شفیق و مہربان ثابت ہوئے جنہوں نے انہیں بے شمار اذیتیں دی تھیں۔ سب کو معاف کر کے انانیت کو اپنے پاؤں تلے روند کر ایک ایسی مثال قائم کر لی کہ جس کی اگر آج بھی تقلید کی جائے تو آج کی آگ اگلتی زندگی امن و آشتی کا گھوارا بن جائے گی۔

......☆☆......

زندگی......!

امید کا دیا

زندگی یاس و آس کا نام ہے۔اس میں نشیب و فراز ہیں۔اس میں یقین وگماں ہیں۔اس میں آہیں ہیں لیکن راہیں بھی۔ زندگی کے اس گلستان میں دونوں طرح کے پھول کھلتے ہیں۔خوشی کے بھی اور غم کے بھی۔ اس میں اچھے دنوں کی بہار ہوتی ہے اور برے دنوں کی خزاں بھی۔زندگی جیتے جیتے کبھی کبھی ہمیں تاریکیوں سے اس قدر الجھنا پڑتا ہے کہ گماں ہوتا ہے کہ تاریکیوں کے اس قید سے شاید ہی کوئی سحر نو ہمیں آزاد کرانے آئے گی۔ایسے یاس و تعطل کے رنجیدہ ماحول میں اگر کوئی ٹمٹماتی شمع ہی نظر آئے تو پھر سے امید بندھ جاتی ہے جو ہمارے ٹوٹے حوصلے کو کس دیتی ہے اور ہمیں جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

امید انسانی ذہن کی وہ کیفیت ہے جس میں وہ اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ آنے والا پل یا آنے والا کل اس کے لیے ایک نیا پُر مسرت پیغام لانے والا

ہے۔ یہ وہ دماغی حالت ہے جس میں انسان آلام ومصائب کی چکی میں پستے وقت اپنا حوصلہ قائم رکھتا ہے اس بل بوتے پر کہ یہ چکی اُسے آزماتے آزماتے گھِس جائے گی لیکن اس کا حوصلہ ٹوٹے گا نہیں اور پھر یوں ہوگا کہ اُس کی زندگی کا ایک نیا سنہری باب شروع ہو جائے گا۔

انسان کوئی نیک کام کرتا ہے اس امید پر کہ اُسے اِس کا اجر ملے گا۔ گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اس امید پر کہ خداوند تعالیٰ اسے انعام واکرام سے نوازے گا۔ یہی اُمید اُس کے ہارے ہوئے حوصلے کو ایک نئی جلا بخش کر پھر سے تر وتازہ کر دیتی ہے۔ بس پھر کیا......؟ حوصلہ تازہ ہو گیا تو سمجھو زندگی دوڑنے نہیں بلکہ اُڑنے لگتی ہے۔ امید کے ساتھ اپنا بندھن جڑانے والے کے بوجھل قدم ایکدم ہلکے ہو جاتے ہیں اور اُسے اپنی منزل پانے میں ایک لذّت سی محسوس ہو جاتی ہے۔ دراصل امید کے دامن کے ساتھ چمٹے رہنا ہی عقلمندی ہے کیونکہ امید کا دامن چھوڑنے سے امید نہیں بلکہ امید چھوڑنے ولا خسارے میں رہتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اگر حضرت یوسفؑ گہرے کنویں میں پھینکے جانے کے بعد حوصلہ ہار کر امید کا دامن چھوڑ دیتے تو وہ مصر کے تاج وتخت کے مالک نہ بن جاتے۔ اگر حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ کے اندھیرے میں امید کا چراغ روشن نہ رکھتے تو زندگی ایک نیا اجالا لے کر اُن کا استقبال نہیں کرتی۔ ناکامی پر ناکامی کا منہ دیکھ کر اگر رائٹ برادرس مایوس ہوکر اپنی کوششوں کی بساط لپیٹ لیتے تو آج کا ترقی یافتہ انسان اونچی فضاؤں میں اڑان نہیں بھر رہا ہوتا۔

امید ایک ایسی انمول چیز ہے جو ایسے موقع پر معجزے دکھاتی ہے جب عقل کے سارے برق رفتار گھوڑے تھک ہار کر مایوسی اور حسرت کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن امید کا خزانہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا ہے۔ بہت سارے

لوگ اس خزانے کو حاصل کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غیر شعوری کوششوں میں خود کو الجھا کر رکھتے ہیں۔ ہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں اپنے جنون کے بل پر یہ خزانہ حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ جنون اور امید ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کتنی جلدی کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ تو امید کا دامن تھامے رہتے ہیں اور اپنے مقصد کے حصول میں مگن رہتے ہیں۔ پھر دیر یا سویر انہیں اپنی منزل مل ہی جاتی ہے۔ حالانکہ امید ہی انسان کو نا امید کر دیتی ہے۔

جب انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ یا کسی چیز یا واقعے کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کر دیتا ہے تو ناکامی کی صورت میں وہ بہت ہی نا امید ہو کر حوصلہ ہارنے لگتا ہے کیونکہ جس کامیابی کی وہ امید لگائے بیٹھا ہوتا ہے وہ کامیابی نہ ملنے پر انسان کا افسردہ ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ ناکامی یا نا امیدی کے بعد پھر سے امید کو گلے لگانا اور اپنے روشن مستقبل کے خواب دیکھنا واقعی دیوانوں کا کام ہے۔ لہٰذا اگر امید کے ساتھ محبت کے بجائے عشق ہو تو ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے کہ امید انسان کو کبھی نا امید نہیں کرتی ہے۔ دوسری طرف جو لوگ امید کو نظر انداز کر کے اپنی عقل کے سرکش گھوڑے دوڑاتے ہیں وہ ذرا سی ناکامی دیکھتے ہی بوکھلا جاتے ہیں۔ کافی پچھتاوے کے بعد انہیں امید یاد آ جاتی ہے لیکن وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ ہار ان کا مقدر بن چکی ہوتی ہے۔ پھر انہیں امید کیا امید کا ہلکا سا سایہ بھی نصیب نہیں ہو جاتا ہے۔ نا امیدی بڑے بڑے لشکر لے ڈوبی ہے، بڑے بڑے ناموں کو خاک میں ملا چکی ہے، نامی گرامی سلطنتوں کا تاخت و تاراج کر چکی ہے اور کتنے ہی مغرور بادشاہوں کو دھول چٹا کر تاریخ بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس امید نے چھوٹے چھوٹے ذرّوں کو آفتاب کر دیا، عرب کے چرواہوں کو اقوامِ عالم

پر حکومت کرنے کا سلیقہ دیا، کمزور لشکروں سے عزم و ہمّت کی قابل تقلید مثالیں قائم کرادیں اور عالمی سطح پر بے شمار نا قابلِ یقین تغیرات معرض وجود میں لائے۔

امید ایک ایسی صورتحال ہے جس میں کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا اور نہ کچھ واضح طور پر پوشیدہ رہتا ہے۔یہی ایک قسم کی دھندلاہٹ ہچکولے کھاتی زندگی کا سہارا بن جاتی ہے۔جب ہاتھ میں موجود سارے پینترے ختم ہوجاتے ہیں تو بس ایک امید ہی باقی رہ جاتی ہے۔بقول امیر قزلباش ؎

مرے جنون کا نتیجہ ضرور نکلے گا
اسی سیاہ سمندر سے نور نکلے گا

یا فانی بدایونی یوں کہتے ہیں ؎

ناامیدی موت سے کہتی ہے اپنا کام کر
آس کہتی ہے ٹھہر خط کا جواب آنے کو ہے

......☆☆......

زندگی......!

والدین کی ذمہ داریاں

ہوس کا شکار ہو کر جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو حضرت آدمؑ کے لیے ایک بہت ہی پریشان کن صورتحال نے جنم لیا۔ ایک طرف اُسے اپنے جوان سال بیٹے کے کھو جانے کا غم تھا تو دوسری جانب یہ اُداسی کھائے جا رہی تھی کہ اس کا بڑا بیٹا خدائی احکام کو بالائے طاق رکھ کر من مانیاں کرتا جا رہا تھا۔ یہی وہ لمحات تھے جب پہلی بار کائنات کے معرض وجود میں آنے کے بعد والدین کو اپنے بچوں کی فکر ستانی لگی۔ وہ اس بات کے لیے پریشان ہونا شروع ہو گئے کہ ان کی اولاد قواعد و ضوابط کو اپنی زندگی پر لاگو نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت آدمؑ چھوٹے بیٹے سے ازحد پیار کرتا تھا اور بڑے بیٹے سے پدرانہ شفقت سے لبریز ہونے کے باوجود نفرت کرتا تھا۔ وہ محض اس لیے کہ اس کا چھوٹا بیٹا ہابیل ایک با اخلاق انسان تھا۔ وہ خدائی احکام کا پابند تھا اور اپنے بڑے بھائی قابیل کے

برعکس والدین سے محبت بھی کرتا تھا۔ ہابیل کی موت کے بعد حضرت آدم اور حضرت حوا کی حالت زار کو دیکھ کر یہ بات کب کی روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ والدین کی اپنی اولاد کے تئیں محبت وشفقت کی کچھ شرائط ہیں جو اگر ان کے لخت جگر پورا کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں ہیں تو وہ والدین کی محبتوں اور شفقتوں کے قطعاً سزاوار نہیں ہیں۔لیکن صد افسوس کہ اس حوالے سے جب ہم اپنے آج کے پُرآشوب دور کی بات کرتے ہیں تو مایوسی چھا جاتی ہے۔

آدم کے زمین پر آکر دنیا بسانے سے لے کر آج تک انسان لامتناہی آلام ومصائب جھیل کر ایک آرام دہ مقام حاصل کر چکا ہے۔آرام وآسائش کے لمحات میں انسان خدا کو بہت کم یاد کرتا ہے کیونکہ شیطان اس پر غالب آکر اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ چند خوشیاں حاصل کر کے اس نے بحر و بر کو اپنی مٹھی میں قید کرلیا ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ بس شیطانی مکر وفریب ہوتے ہیں جو انسان کو ایک اعلیٰ وارفع مقام سے اٹھا کر پستیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔آج جہاں ہر طرف بے راہ روی کا دور دورا ہے والدین کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ایسے حالات میں کوئی ماں یا باپ آرام کی نیند کیسے سوسکتا ہے جب ہر طرف اخلاق سوز مناظر احساس کے قلب وجگر کو چھلنی کر رہے ہوں۔جب علم وحکمت کے نام پر جہالت پڑھائی جا رہی ہو۔جب جھوٹ کی حکمرانی ہو۔جب ہر سو عریانیت کے ایمان سوز مناظر ہوں اور جب شیطانیت کے پرستاروں کے ہجوم نے حق پر شکنجہ کس لیا ہو۔لیکن حالات کتنے ہی کٹھن ہوں والدین اپنے بچوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت سے پہلو تہی کا ارتکاب نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ والدین کی گود ایسی جگہ ہے جہاں سے انسانیت اڑان بھرتی ہے۔یہیں سے معاشرے کو عزو اقبال فراہم ہو جاتے ہیں۔یہیں سے چاند پر

کمند ڈالنے والے سائنسدان جنم لیتے ہیں۔ ہاں والدین کی گود ہی ایسی متبرک جگہ ہے جہاں اولیاء کرام اور بزرگان دین و ملت پروان چڑھتے ہیں۔اسی شفقت بھری گود میں انسانی وسائل پنپتے ہیں اور زندگی کو معنی ملتے ہیں۔

یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی ہے کہ اولاد کو ایک مثالی انسان بنانے کی از حد کوشش کے با وجود اولاد گمراہ ہو جاتی ہے یا پارسا بن جاتی ہے بلکہ یہ معنی رکھتا ہے کہ والدین اپنے بچے کو ایک نیک اور ہنر مند انسان بنانے کی کس حد تک سنجیدہ کوششیں کرتے ہیں۔ انسان جس چیز کی تہہ دل سے کوشش کرتا ہے اسے وہ ضرور مل جاتی ہے۔اگر یہ دیکھا جائے کہ آج کے والدین میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنی اولاد کی جسمانی اور ذہنی تربیت اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے کی اخلاقی بندشیں ہیں تو بس کف افسوس ملنا پڑتا ہے۔حُبِ اولاد آج کے والدین پر اس قدر غالب آچکی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ہر جائز و نا جائز فرمائش کو پورا کرنے میں کسی تأمل سے کام نہیں لیتے ہیں۔انہیں لگتا ہے کہ شاید ان کی زندگی کا واحد مقصد بس یہی ہے کہ اپنے بچوں کو جسمانی طور توانا، ذہنی طور چالاک اور مالی طور مضبوط بنایا جائے۔چنانچہ بچوں کی دینی اور اخلاقی حس بیدار ہو یا نہ ہو اس انتہائی اہم پہلو کی طرف بہت کم دھیان دیا جاتا ہے۔دولت اور سستی شہرت کمانے کی دوڑ میں ہر کوئی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر جو سنجیدہ جدو جہد کرتا ہے اگر بچوں کی روحانی تربیت کے حوالے سے بھی ایسی کوئی مخلصانہ کوشش کی جاتی تو یقیناً معاشرتی بحران اس قدر سنگین نہیں ہوتا۔

دنیا کی جتنی بھی نامور ہستیاں گزری ہیں سب کی سب والدین کے شفقت بھرے سایوں میں پل پوس کر ہی ایسے مقام پر پہنچے جہاں انہوں نے نہ صرف اپنی شناخت قائم کی بلکہ اپنے ملکوں اور قوموں کی پہچان بھی کرائی۔ یہاں

ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں کہ ان نامور ہستیوں کی دینی اور اخلاقی تربیت کے حوالے سے ان کے والدین بہت ہی حساس تھے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ آسمان سے نہیں اترے۔ وہ کسی پریوں کی دنیا سے بھی نہیں آئے۔ انہوں نے بھی ماں کی کوکھ سے جنم لیا۔ ماں باپ کی محبتوں کے سائے میں وہ بھی جوانی کی دہلیز کو پہنچے۔ اُن کی تربیت بھی غریب والدین کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ اسی تربیت کا فیض تھا کہ اقبالؒ کا قلم عشق رسول ﷺ کے جام اچھالتا رہا۔ اور پھر شاعر مشرق علامہ اقبالؒ خود اپنے بیٹے جاوید اقبال کی تربیت کے حوالے سے کس قدر فکر مند تھے کہ اپنی تخلیقات کا بیشتر حصہ ان کی نذر کر کے ساری عمر اسے خودی کا درس دیتے رہے۔ اسی طرح لقمان نے اپنے بیٹے کو جہاں محبتوں کا جھولا جھولایا وہاں اسے نفس کے سرکش گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی خاطر اخلاقیات کا انمول سبق بھی پڑھایا۔ اسے ایمان ووفا کے بول سکھائے۔ اسے لا تشرك بالله جیسے ایمانی جوہر سے مالا مال کیا۔ اسے لا تمش فی الارض مرحا کی ندامتی سوغات سے نوازا۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کو جہاں اپنی والدہ ماجدہ نے ممتا کے جام پلائے وہاں اسے حق گوئی کی تلقین کرتے کرتے ایمان وتقویٰ کے اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

الغرض جتنی بھی مثالیں ہم لیں گے سب کی سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی بھی ماں یا باپ اپنے بچوں کو پراون چڑھاتے چڑھاتے اگر انہیں اخلاقیات اور ایمانیات سے آراستہ کرنے میں کسی کوتاہی سے کام لیتا ہے تو وہ ایک اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ آج کے والدین اپنے بچوں کے ساتھ بے پناہ پیار کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بچوں کی ہر جائز و ناجائز فرمائش کو پورا کرنا ہی والدین اپنا واجد فرض سمجھ لیں۔ وہ پیار پیار ہی کیا جو بچے کو رضائے

الٰہی کے میٹھے پھل نہ چکھوائے اور قہر الٰہی کی وعید نہ سنوائے۔ اپنے بچوں سے پیار جانور بھی کیا کرتے ہیں اور شاید انسانوں سے بھی زیادہ کرتے ہیں لیکن ان کا پیار شعور اور اخلاقیات سے خالی ہوتا ہے۔ پھر فرق کہاں رہ جاتا ہے اگر بچوں کے لیے ماں باپ کا پیار بھی جانوروں کی طرح غیر مشروط ہو۔ معاشرے کو قدآور فربہ جسموں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے اسے تو ایسے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اخلاقیات کا نمونہ ہوں، علم و حکمت سے لیس ہوں اور انسانیت کی دولت سے مالا مال ہوں۔ یہ سارے متبرک کام والدین ہی کر سکتے ہیں۔ وہ بے شک اس سلسلے میں اساتذہ کرام، مذہبی علماء اور سماجی علم برداروں کی معاونت طلب کر سکتے ہیں لیکن اساسی کام بہر حال والدین کو خود کرنا ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

عورت کے سائے میں

عورت خالق کائنات کی ایسی تخلیق ہے جس نے نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کے پھیکے خاکوں میں رنگ بھر دیا بلکہ زندگی کے معنوں کو ایک نئی وسعت دیدی۔قدرت کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں میں غوطہ زن شاعروں اورفلسفہ دانوں نے شاید اسی بناء پر اپنے بیشترفن پارے عورت کی نذر کر دیے۔بلبل کے گیت ہوں یا کوئل کی کوک ، پھولوں کی مہک ہو یا جھرنوں کا راگ ،شبنم کے موتی ہوں یا ساون کی بر کھا،اُبلتے چشمے ہوں یاخاموش سمندر،بل کھاتی ندیاں ہوں یا مرغزاروں کی بساط،قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز کا لطیف احساس ہمارے دلوں کے اندرتب اُجاگر ہوتا ہے جب عورت جیسی پُر جمال شے سے آسمانِ انسانیت مزیّن ومرصع ہے۔ بقول اقبال :

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
ہے اسی کے ساز سے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اُسی دُرج کا دُرِ مکنوں

نازک چیزیں اجمل ہوتی ہیں۔نزاکت اور خوبصورتی دونوں کسی چیز میں بیک وقت موجود ہوں تو اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ ایک غیر فطری عمل ہے۔چونکہ عورت بہت سارے نازک اور حسّاس کرداروں کا ایک امتزاج ہے لہٰذا اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ تلاشنا اس کے ساتھ نا انصافی ہے۔مالی کتنا بھی کوشش کرے کہ پھولوں کی نازک ڈالی کو سہارے دے کر اپنی مرضی کے عین مطابق ایستادہ رکھ سکے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ پھول بڑے نازک ہوتے ہیں۔عورت بھی تو اک پھول ہے جس کی بھینی بھینی خوشبو سے گھر کا چمنستان ہر پل لبریز رہتا ہے پھر اس کے ساتھ ہم پھولوں جیسا برتاؤ کیوں نہیں کرتے؟ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو فرسودہ خیالات کے لوگ اپنی کج فہمی کی وجہ سے عورت کو اپنے من پسند سانچے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایک انتہائی خطرناک فعل کا ارتکاب کر رہے ہیں۔حقیقتاً ایسے لوگوں کے پاس ادراک کی کمی ہے اور مغربی ممالک اس لاعلمی کا زیادہ شکار ہو گئے اور اس کا خمیازہ بھی اٹھا رہے ہیں۔

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے ایک طرف مرد کی سخت جانی، سنگ دلی اور بے پرواہی اور دوسری طرف عورت کی نزاکت، رقیق القلبی اور جذبۂ وفا کی سرشاری اور پیچ پہ پیچ یہ کہ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے زندگی کے اتار و چڑھاؤ سہہ لیتے

ہیں۔قانونِ زیست ایسا کہ دونوں کو کندھے سے کندھا ملا کر اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کے غم بانٹ کر سفرِ حیات کو جاری و ساری رکھنا ہے۔ ایسے میں کیسے ممکن ہے کہ کاروانِ زیست کے دو اہم کردار ایک دوسرے کو سمجھے بغیر اپنا فرضِ منصبی ادا کر سکیں۔ہم ایسا کہہ سکتے ہیں کہ مرد کی زندگی میں عورت ایک خوبصورت آزمائش ہے بالکل جس طرح خلد میں آدم کے لیے عورت ایک کڑی آزمائش ثابت ہوئی۔لہٰذا اس پس منظر میں مرد کا ایک خاص کردار بنتا ہے کیونکہ ؎

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد

اُسے عورت کی نازک مزاجی کو ہر لمحہ ملحوظِ نظر رکھنا ہوگا عورت کی فطری پیچیدگیوں کو باریک بینی سے پڑھنا ہوگا اور مرد کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ عورت کو خلافِ فطرت چلانے کی سعی لاحاصل نہ کرے کیونکہ ؎

ہزار بار حکیموں نے اسے سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین

عورت کی نازک اندامی کا پاس و لحاظ رکھنا اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ کسی سماج کے خدوخال وضع کرنے میں عورت ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہمارے گھر کی عورت زندگی کے ہر شعبے میں ملوث ہو چکی ہے، گھر کے معاملات ہوں یا سیاست ہو، بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہو یا اُن کی رشتۂ ازدواج کی بات ہو، رشتے توڑنے یا جوڑنے کی بات چلے یا خرید و فروخت کا کوئی معاملہ ہو، تعزیت پرسی ہو یا کسی مریض کی مزاج پرسی غرض ہر حساس مسئلے

میں ہمارے ہاں عورت ایک نمایاں کردار نبھا رہی ہے مطلب عیاں ہے کہ ہم اس حقیقت سے چشم پوشی کے متحمل نہیں بن سکتے کہ عورت ہماری سماجی اور قومی شناخت کے حوالے سے بیش بہا قدر و قیمت کی مستحق ہے۔

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

کچھ قلیل العقل لوگ عورت کی خامیوں کو سامنے لاکر بہت سارے اعتراضات اٹھاتے ہیں مگر بدقسمتی سے ان کی نظر عورت کی ان خوبیوں پر نہیں جاتی ہے جو کہ اس کے اندر پنہاں ہیں۔ عورت اگر آگ ہے تو توانائی کا منبع بھی ہے۔ عورت اگر پریشانی ہے تو راحت بخش بھی ہے۔ عورت اگر فساد ہے تو امن و آشتی کی کوکھ بھی ہے۔ عورت اگر نادان ہے تو لقمان اور افلاطون کو جنم بھی دیتی ہے۔ عورت اگر خار ہے تو باہوں میں گلاب بھی کھلاتی ہے۔ عورت اگر ایک خواب ہے تو ہم اس کی تعبیر ہیں۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم عورت کا کون سا روپ قبول کریں فیصلہ بہر صورت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ بات بالکل واضع ہے کہ ہم خسارے میں رہیں گے اگر ہم عورت کی نزاکت والی صفتِ حسنہ کو یکسر نظر انداز کر کے اُسے خار برداری کا کام سونپیں۔ عورت مرد کی غلام ہے نہ افرادِ خانہ کی نوکرانی۔ وہ بازاروں کی رونق ہے اور نہ محفلوں کی زینت، کیف و مستی کا ذریعہ ہے اور نہ کوٹھوں کی لونڈی۔ ہاں یہ طے ہے کہ اسے اپنے شوہر کے تئیں وفا شعاری کا معیار بہر صورت اعلیٰ رکھنا ہے۔ کیونکہ عورت گھر میں ایک چاند کی مانند ہے جو جتنا چمکے گا اتنا ہی گھر کا کونہ کونہ روشن رہے گا۔ گھر کی کامیابی اور ترقی عورت ہی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

از آدم تا ایں دم عورت کی ذات پر زمانے کا ہر پھیر بدل اثر انداز ہوتا

رہا۔ نتیجتاً کبھی وہ شاہی ہوس کی شکار ہوئی تو کبھی قذاقوں کی چنگل میں آگئی۔ کبھی گھریلو سب و شتم کا نشانہ بنی تو کبھی زاہدوں کے متبرک ہاتھوں پائمال ہوگئی۔ کبھی مذہبی جنون کی لپیٹ میں آگئی تو کبھی مُلحِدانہ لہروں نے اُسے گھسیٹ لیا۔ بہرحال استحصال کی کوئی بھی شکل ہو عورت، تاریخ کے چند برسوں کو چھوڑ کر، کبھی بھی اپنے اُس مقامِ ارفع کو نہ پاسکی جس کی کہ وہ حقدار ہے اور شاید ہی کبھی پا سکے گی۔ عورت کو خود بھی ایک بہت بڑا فرض نبھانا ہے۔ اسے اپنی ذہانت اور عقلِ سلیم سے ہر استحصالی وار کو روکنا ہوگا۔ اُسے جدید دور میں گونجتے آزادئ نسواں کے نعروں میں چھپے مذموم ارادوں کو بھانپ لینا ہوگا اور اپنے وجود کو اس قدر وزن دار اور بارعب بنانا ہوگا کہ کوئی بھی شیطانی رُستم دیکھتے ہی چاروں شانے چت ہو جائے۔ ظاہر ہے ایسا کرنا بہت کٹھن اور دُشوار ہوگا مگر جس ماں، بہن یا بیٹی کے نازک ہاتھوں میں قرآن و سُنّت کی پتوار ہو اُس کا سفینۂ حیات کسی بھی طوفانِ بدتمیزی میں ہچکولے نہیں کھا سکتا ڈوبنے کی تو بات ہی نہیں۔

......☆☆......

زندگی......!

تفریحات کی نذر ہوگئی

قدرت نے انسان کو زمین پر بسایا تو ساتھ میں اُسے زندگی گزارنے کے طور طریقے بھی بتلا دیے۔ کھانے پینے کے مسائل، معاشرتی مسائل، مذہبی مسائل، سیاسی و قانونی مسائل وغیرہ الہامی کتابوں کے ذریعے سب کچھ واضح کر دیا۔ بتدریج انسان نے خدائی احکامات کو پس پشت ڈال کر اپنے لیے من پسند قوانین وضع کیے۔ نتیجتاً انسانی زندگی کا توازن بگڑتا گیا ہے اور اب انسان ایک ایسی تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے جس کا وہ قطعاً متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ پہلے پہلے انسان کو سختیاں جھیلنے کی عادت تھی۔ مشکل سے مشکل کام بھی وہ صبر و استقلال کا جامہ پہن کر انجام کو پہنچاتا تھا۔ لیکن جب انسان نے کائنات کو مسخر کرنے کی کوششیں شروع کیں تو اس نے بہت ساری ایسی ایجادات اور دریافتیں منظر عام پر لائیں جن کی بدولت اس کی زندگی قدرے آرام سے گزرنے لگی ۔آج انسان زندگی کے ایک

ایسے پائدان پر قدم رکھ چکا ہے جہاں اس کی زندگی نہایت ہی آرام دہ ہے۔ قدرتی عمل ہے کہ جب انسان آرام دہ زندگی گزارنے لگتا ہے تو یکا یک اُسے شیطانی قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ ایمانی انحطاط دبے پاؤں آکر اس کے عالم شعور میں ایک ویرانی سی پسارتا ہے جس میں ایمان و وفا کے پھول کھلتے ہیں اور نہ میٹھے بول بولنے والی کوئی بلبل نغمہ سرا ہوتی ہے۔ اس کی ہر سانس پر شیطانی پہرہ بیٹھ جاتا ہے اور اس کے اندر اخلاقی اجالوں کا سورج ماند پڑ جاتا ہے۔ نحوست کی ایک ایسی تاریکی اس پر سایہ فگن ہو جاتی ہے جو اسے برے اور بھلے کی تمیز سے معذور کر دیتی ہے اور وہ ایک خوشنما حیوان بن جاتا ہے۔

ان سارے محرکات کے پس منظر میں انسان نے اپنے من کو بہلانے کی خاطر تفریح کے نام پر بہت سارے نئے نئے خیالات گڑھ لیے۔ پہلے پہل انسان تفریح کے نام پر جانوروں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اس قسم کی تفریح میں انسان کو بہت سے فائدے ہوتے تھے۔ وہ قدرت کی تخلیق کردہ شاہکاری کو دیکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ جانوروں کو شکار کر کے وہ اپنا پیٹ پالتا تھا اور پھر شکار کی تلاش میں جنگلوں کے جنگل چھان مار کر وہ وقتاً فوقتاً بہت ساری نئی چیزیں دریافت بھی کر لیتا تھا۔ آج کا انسان اُس دور سے نکل کر بہت آگے جا چکا ہے۔ وہ سائنس کے ذریعے دنیا کو تقریباً تسخیر کر چکا ہے۔ اسے اب جانوروں کا شکار کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اُس کے اندر قدرتی مناظر دیکھنے کا شوق باقی رہا ہے اور پھر کرۂ ارض پر شاید ہی کوئی ایسی چیز بچی ہے جو اس کی نظر میں آئی نہ ہو۔ لیکن آج بھی انسان قسم قسم کی تفریحات کے ذریعے اپنا من بہلانے میں لگا ہے۔ فلم بینی، مختلف اقسام کے کھیل جو یا تو کھلے میدان میں کھیلے جاتے ہیں یا پھر اندر بیٹھ کر، پہاڑی مقامات کی سیر، باغ بغیچوں میں بیٹھ کر ضیافتوں کا لطف

اٹھانا، کلبوں میں جا کر راتیں گزارنا وغیرہ وغیرہ ایسی تفریحات ہیں جو آج کل کے انسان کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

ظاہر ہے کہ آج کے انسان کی تفریحات مذہب یا کسی مروجہ قانون کی بندشوں سے آزاد ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سیر و تفریح کے نام پر فحاشی اور بے حیائی کو عروج مل رہا ہے۔ حالانکہ قدرتی مناظر کی سیر کرنا ایک جائز تفریحی کھیل ہے جس کی کسی بھی مذہب میں ممانعت نہیں ہے۔ پہاڑی سیر گاہیں، وہاں کے اودھم مچاتے آبشار، گنگناتے جھرنے، بل کھاتی اور شور مچاتی ندیاں، میٹھے پانی کے چشمے، حسین سرسبز مرغزار، وسیع و عریض وادیاں، فلک بوس پہاڑ وغیرہ سب قدرت کی عطا کردہ عظیم عنایتیں ہیں جن کا لطف اگر انسان نہیں اٹھاتا ہے تو خسارے میں ہے۔ دل دکھانے والی بات یہ ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں کا غلط استعمال کر کے انسان نہ صرف یہ کہ قدرت کے غیض کو دعوت دیتا ہے بلکہ اپنے نکما ہونے کا بین ثبوت بھی دیتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ایسے دلفریب مناظر کو دیکھ کر، باغوں کی کیاریوں میں نکھرتے پھولوں کے رنگ و بو کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کر کے، فلک بوس پہاڑوں کا پھیلاؤ آنکھوں میں سما کر فوراً وہ ذات ہمیں یاد آتی جس کا نور ان ساری پُرکشش چیزوں میں رقصاں ہے۔ لیکن معاملہ الٹا ہے۔ ان سرسبز اور شاداب باغوں اور سیر گاہوں میں پہنچ کر انسان اچانک یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اخلاقی اور قانونی کھونٹے کے ساتھ ایک ڈور کے ذریعے بندھا ہوا ہے۔ قدرتی مناظر کی ٹھنڈی چھاؤں میں اس کی ایمانی حرارت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور تمام بندشوں کو روندتے ہوئے وہ شیطانی حرکات و سکنات کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔

دراصل باطل قوتوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو ترقی اور جدت طرازی کے نام پر ایسا سبق پڑھایا جائے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کو بھول کر

مغربیت کو گلے لگائیں اور اسی میں اپنی منزل تلاش کریں۔تندرستی کے حوالے سے ایجاد کیے گئے مختلف کھیلوں کو شاطرانہ انداز میں جوے کا روپ دیا گیا ہے۔ ان کھیلوں کی ترویج کے لیے ان کی اس انداز میں تشہیر کی جاتی ہے کہ ہم اسی چیز کو اپنی زندگی کا مقصد بنا دیتے ہیں۔مختلف کھیل کھیلنا، سیر و تفریح کی خاطر باغ باغیچے سنوارنا، کوہستانی روح افزا مقامات کی دیکھ ریکھ کر کے انہیں جاذب نظر بنانا، ہر چھوٹے بڑے شہر میں تفریحی پارکیں قائم کرنا یا ایسے ہی دوسرے کام کرنا یقیناً ترقی اور خوشحالی کی علامات سمجھی جاتی ہیں لیکن یہ سب کچھ ان قوموں کے لیے قیمت اور اہمیت رکھتا ہے جو اخلاقی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوں۔دینی اعتبار سے ہم جیسے ترقی پذیر لوگوں کے لیے ایسے مقامات اولین ترجیحات میں شامل نہیں ہو سکتے۔

......☆☆......

زندگی......!

گلستانِ مذہب میں اڑتی بلبل

مذہب کیا ہے؟ مذہب کائنات کی عظیم ترین ہستی یعنی خدائے ذوالجلال یا ایک یا زیادہ دیوتاؤں پر ایمان لانے اور پھر اُن کی عبادت کرنے کا ایک مخصوص نظام ہے۔ مذہب کے نام پر انسان جس ہستی کی بندگی کرتا ہے وہ ہستی ایک مافوق الفطرت قوّت ہوتی ہے۔ انسان اُس قوّت کو اطاعت، عزت اور عبادت کے لیے تسلیم کرتا ہے۔اس لحاظ سے مذہب مقدّس رسم و رواج یا اعمال کے سرانجام دیے جانے کا عمل ہے۔ جوانسان جس مذہب کے دائرے میں آکر اُس کو اختیار کرلیتا ہے وہ اس مذہب کو اپنے طرزِ زندگی کے طور چُن لیتا ہے۔ویسے مذہبی اقدار اور اصولوں کے بارے میں بحث کرنا یا ان کے لیے لڑنا آسان ہے مگر اپنی زندگی کو ان اصولوں کے سانچے میں ڈالنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔عمومی طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر کوئی ایمان اور اعتقاد کی باتیں کرتا ہے اور اپنے مذہب کے تئیں اپنی

محبت کا سینہ تان کے اظہار کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ حیات انسانی کے حوالے سے ایسا کوئی بھی مظاہرہ بہت ہی قابل تعریف ہے اور معاشرے کے حوالے سے حوصلہ افزا بھی ہے لیکن یہ سب کچھ تب قدرو قیمت کا حامل بن جاتا ہے جب مذہبی اصولوں کی بات کرنے والا انسان اپنی زندگی کو ان کے تابع کر دے۔ چناچہ ہر مذہب کے اپنے اپنے اصول ہیں جن پر سختی سے عمل کرنا ہی اس مذہب کے تئیں محبت وعقیدت کا اصل اظہار ہے۔ان مذہبی اصولوں میں ردو کد نکالنا کسی بھی اعلیٰ یا ادنیٰ شخص کے حد اختیار میں نہیں ہے۔ویسے بھی مذاہبِ عالم کے اکثر قواعد و ضوابط مشترکہ ہیں مثلاً قتل انسان، جھوٹ و دھوکہ دہی،لوٹ مار اور ڈاکہ زنی، فحاشی اور بدکاری وغیرہ ہر مذہب میں حرام ہیں۔اسی طرح دنیا کا ہر مذہب اس بات کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ چھوٹوں پر رحم کیا جائے اور بڑوں کی عزت ہو،عورتوں کے حقوق کی پاسداری ہو اور ان کی حرمت کی پاسبانی کی جائے اور انسانیت کا احترام کیا جائے۔ نیلے آسمان کے نیچے عملاً یا جانے والا ہر مذہب ایک خدا کی پرستش پر دلالت کرتا ہے۔اس حوالے سے مجموعی طور پر اگر بات کی جائے تو مذہب کے نام پر کہیں کوئی دھنگا یا فساد نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے موجودہ دور کے فتنوں اور لڑائیوں کی بیشتر وجوہات مذہبی ہیں۔

مذہبِ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔انسانی زندگی کا ایسا کوئی گوشہ نہیں ہے جس کے بارے میں اس مذہب نے رہنما اصول وضع نہیں کیے ہیں۔ غسل خانے سے لے کر ایوان حکومت تک کے سارے مسائل کا تیار بہ تیار حل اسلام ہی مہیا کرتا ہے۔اسلامی تعلیمات میں ہے کہ ایک مسلمان نہ اتنا بے غیرت ہونا چاہیے کہ اس کی خودی کو روندا جائے اور وہ اف تک نہ کہے اور نہ اس قدر شدت پسند ہو کہ مذہبی جنون کا شکار ہو کر وہ گلشن انسانیت پر بجلیاں برسانا بھی عین

عبادت سمجھنے لگے۔ کوئی نیک کام اگر برے طور طریقوں سے انجام پاتا ہے تو اس کی اچھائی زائل ہو جاتی ہے کیونکہ اس ایک نیک کام کی آڑ میں کئی نئے گناہ جنم لیتے ہیں۔ کسی غریب اور مفلس کی جھونپڑی کو گرانے کا لائسنس کسی کو اس لیے حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہاں پر ایک مسجد تعمیر کی جائے گی۔ ایک دشمن کو مارنے کے لیے دس بے گناہوں کو موت کے منہ میں دھکیلنا کوئی بہادری نہیں ہے۔ کوئی شخص اگر قاتل ہے اور وہ مسجد میں پناہ لیتا ہے تو اسلام کی رو سے اس کے مسجد سے باہر آنے تک اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے کیونکہ مسجد دارالامن ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ اب مسجدوں کو بھی بموں سے اڑا کر ایک نہیں بلکہ درجنوں نمازیوں کو خون میں نہلایا جاتا ہے۔

ہر اسلامی قانون کو نافذ کرنے کی اولین اور اہم شرط اسلامی نظام حکومت ہے جو اگر رائج نہیں ہے تو کسی پر کوڑے نہیں مارے جا سکتے ہیں۔ جب تک معاشرے کو اس سطح پر نہیں لایا جاتا ہے کہ جہاں گناہ کرنا تو دور کی بات، گناہ کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہو اور نیک کام کرنے کے ان گنت اور آسان مواقع فراہم ہوں تب تک شرعی قوانین کا اطلاق محض ایک مذاق ہی ہو گا۔ اب بات یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کیسے نافذ کیا جائے؟ اس کے لیے بھی اولین اور اہم شرط یہ ہے کہ ہر مسلمان فرداً فرداً پہلے اپنے ظاہر اور باطن پر اسلامی نظام حکومت قائم کرے۔ آہستہ اور پیوستہ وقت آنے پر سارا معاشرہ ایک لافانی اجالے سے ہمکنار ہو جائے گا۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے اسلامی معاشرہ تعمیر ہوتا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اپنے نفس کو قابو کر کے صحیح معنوں میں مسلمان بننا اعلیٰ درجے کی روحانیت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن یہ قطعاً ناممکن نہیں ہے۔ قرآن و سنت کی شکل میں ایک عظیم سرمایہ انسانی خدمت کے لیے تا دم

قیامت موجود ہے جو زندگی کے ہر دوراہے پر بھٹکتی انسانیت کی رہ نمائی کرتا رہے گا بشرطیکہ اسے اپنی زندگی کا دستور بنالیا جائے۔ اس میں وقت بھی لگے گا اور سرمایہ بھی۔ یہ کام کئی نسلوں پر محیط ہو سکتا ہے لیکن اس پیغمبرانہ مشن کی فوری شروعات بہت ہی ناگزیر بن چکی ہیں۔

عرب کی جہالت کو ختم کرنے میں اُس عظیم المرتبت پیغمبر ﷺ کو بھی لاتعداد قربانیاں دے کر بیس سال کا عرصہ لگ گیا اور آج یہ کیسے ممکن ہے کہ آج کے اس پُر فتن دور میں راتوں رات اسلامی خلافت قائم کرنے کا خواب دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام کبھی تلوار کی نوک سے نہیں پھیلا ہے۔ دھونس دباؤ والی اسلامی حکومت تاریخ نے افغانستان میں دیکھی ہے۔ جب طالبان حکومت وہاں ختم ہوگئی تو لوگوں نے واویلا کرنے کے بجائے جشن منایا۔ داڑھیاں منڈوانے کے لیے کابل کی گلیوں میں نائیوں کی دکانوں پر غضب کی بھیڑ لگی تھی۔ حالانکہ افغان قوم مذہبی عقیدت کے حوالے سے ایک ممتاز قوم ہے پھر وہاں اسلامی حکومت کا خاتمہ ایک سانحہ تصور کیا جانا چاہیے تھا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بندوق کی نوک پر جو شریعتی نظام انہوں نے تسلیم کیا تھا وہ طالبان کے جاتے ہی انہوں نے فوراً رد کیا۔ اب اگر کوئی یہ جواز پیش کرے کہ حضور ﷺ سے لے کر خلفائے راشدین تک اسلام کی اشاعت کے لیے تلوار کا بے دریغ استعمال کیا گیا ہے تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ان کے ہاتھوں میں تلوار ایک بہانہ تھی۔ اصل میں ان کے اندر روحانی طاقت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس کی دھار لوہے کی بنی تلوار کی دھار سے کئی گنا زیادہ تھی۔ یہ وہ اخلاقی فلسفہ ہے جو قرآنی الفاظ و ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رما میں پوشیدہ ہے۔ اُن کی پرنور پیشانیوں پر ڈھلتی پسینے کی بوندیں آج کے بہتے لہو سے بھی زیادہ رنگین ہوا کرتی تھیں۔ وہ عالم و فاضل بھی تھے اور حکمت و

دانائی کے اعلیٰ نمونے بھی ۔وہ صاحب ثروت بھی تھے اور انجینئر وسائنسدان بھی۔وہ فلسفی بھی تھے اوردانشور بھی۔وہ عظیم المرتبت سیاستدان بھی تھے اور قانون دان بھی۔فی الحقیقت جو طاقت انسان کے سیرت وکردار میں ہے وہ کسی توپ و تفنگ میں نہیں ہے۔اسلحہ اور گولہ بارود کی گھن گرج برسات کی بارش ہے جو برسے تو تباہی مچاتی ہے رکے تو سوکھا ہوتا ہے جب کہ اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے انسان کے سیرت وکردار کی طاقت وہ موسلا دھار بارش ہے جوتھم تھم کے برستی ہے اور جس کا ہر قطرہ زمین کے سینے میں جذب ہوکر اسے سیراب کر دیتا ہے اور اگر رکتی بھی ہے تو اس کا اثر باقی رہ جاتا ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

چاہتوں کا سلسلہ

کہتے ہیں جہاں چاہ وہاں راہ۔ مطلب یہ کہ ہر راستہ چاہت سے کھلتا ہے۔ چاہت ہی زندگی کو رنگین بنا دیتی ہے۔ چنانچہ چاہتیں دل میں پنپتی ہیں لہٰذا دل دماغ کو ہمہ وقت اکساتا رہتا ہے کہ چاہتوں کی تکمیل کی خاطر وہ راہیں تلاش کرے۔ طرح طرح کے دماغ اور طرح طرح کے راستے۔ ہر راستہ جدا جدا اور ہر چاہت الگ الگ۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی چیز کی چاہت ہوتی ہے۔ وہ چیز بھلے ہی کبھی معمولی لگے لیکن چاہنے والا ہی جانتا ہے کہ جس چیز کی تلاش میں وہ نکل پڑا ہے وہ اس کے لیے کس قدر بیش بہا ہے۔ ہر چاہت چاہنے والے کے لیے انمول ہوتی ہے۔ جیسے بنجارے کو ایک گھر چاہیے۔ اندھے کو بینائی چاہیے۔ یتیم کو باپ کا سایہ چاہیے۔ بھوکے کو روٹی کا ایک ٹکڑا، پیاسے کو پانی کی ایک بوند، مظلوم کو انصاف کی کرن یا پھر پروانے کو شمع چاہیے۔

مختلف لوگوں کی مختلف چاہتیں ہوتی ہیں جو معیاری بھی ہو سکتی ہیں اور غیر معیاری بھی۔ یہ انسان کی اخلاقی قدروں اور سوچ کے معیار پر منحصر ہوتا ہے کہ کون کیا چاہتا ہے اور کیوں چاہتا ہے۔ خود غرض لوگوں کی چاہتوں کی بنیاد خود غرضی پر ہوتی ہے۔ اسی طرح اخلاص بھرے لوگوں کی چاہتیں بھی خلوص کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہیں۔

خود غرضی اور لالچ جیسے صفاتِ قبیحہ سے لیس لوگوں کی چاہتیں بڑی ہی عجیب ہوتی ہیں۔ انہیں ہمہ وقت ان چیزوں کی تلاش رہتی ہے جن سے ان کو ذاتی فیض ملے۔ وہ نمک میں مٹھاس تلاش کرتے ہیں یخ میں گرمی ڈھونڈ تے ہیں اور پتھّر میں نرمی۔ اپنی چاہت کی غلامی میں ایسے لوگ کالے کو سفید اور سفید کو کالا بنا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ خود غرضی کے ہاتھوں اپنے ہوش کھو کر ہر اچھی بری چیز کو اپنے دست قبضہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔

سیدھے سادے اور معصوم خیالات کے لوگوں کی چاہتیں بھی معصومانہ ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ آج کے اس ظلم و بربریت والے دور میں ظالم سے انصاف چاہتے ہیں یا پھر بخیل سے خیرات۔ پتھّروں کے شہر میں آکر شیشے کے خریدار ڈھونڈ تے ہیں اور اجنبیوں کے قافلے میں اپنوں کو تلاش کرتے ہیں۔ سادگی کے عالم میں مست یہ لوگ چاہتے ہیں کہ فتنہ انگیز دور میں بھی انہیں سکون کی زندگی جینے کو ملے۔

ویسے جینے کو تو زندگی ہر کوئی جی لیتا ہے لیکن سچّے اور مخلص لوگ ایک منفرد انداز میں اپنی زندگی جی لیتے ہیں۔ زمانہ ان کو نہیں بلکہ یہ خود زمانے کو جینے کے انداز سکھاتے ہیں۔ ان جیسے لوگوں کی چاہتیں بھی منفرد ہوتی ہیں۔ وہ روتی آنکھوں میں مسکراہٹیں چاہتے ہیں۔ تڑپتے دلوں کے لیے سکون چاہتے ہیں۔ سوختہ ارمانوں پر کرموں کی بارش چاہتے ہیں۔ نفرت کی بنجر زمین میں محبت و اخوت کی لہلہاتی فصل چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسانیت ہمیشہ سر بلند رہے، امن کا بول

بالا ہو اور عدل و انصاف کی حکمرانی ہو۔

امیروں کی چاہتیں اگر غریبوں کی چاہتوں سے مختلف نہ ہوں تو وہ امیر کیسے کہلائیں گے۔ امیر لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا کی دھن دولت کسی سیلابی ریلے کی مانند ہمیشہ ان کے گھر کا رخ کرے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے دولت خانوں کی دہلیز پر عیش وعشرت کے قافلے پڑے رہیں۔ کچھ ایسے ہی خواب اور چاہتیں غریب لوگوں کے بھی ہوتے ہیں لیکن ان کی چاہتیں ان کی اوقات کے مطابق ہوتی ہیں اور ان کے خواب ان کی بساط کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ بھی اپنے سر ہیروں اور یاقوت سے مزیّن تاج رکھنا چاہتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہوتا ہے کہ خیالی پلاؤ کھانے سے کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ جانتے ہیں کہ نیلے آسمان پر بے شمار ستاروں کو وہ جھلملاتے دیکھ سکتے ہیں لیکن ان لاکھوں کروڑوں ستاروں میں سے کوئی ستارہ توڑ کر نہیں لا سکتے۔ وہ چاند کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کی سکون بخش روشنی سے بہرہ مند بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس کی چاندنی کو قید نہیں کر سکتے۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ زندگی چاہتوں کے بغیر بھی بسر ہو سکے؟ حقیقتاً زندگی بجائے خود ایک بہت بڑی چاہت ہے۔ موت کتنی بھی دور ہو انسان ہمیشہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کی کبھی شام نہ ہو۔ یوں انسان کی سب سے بڑی چاہت زندگی بن جاتی ہے۔ پھر زندگی سے جڑی بے شمار چاہتوں کا ایک سلسلہ وجود میں آجاتا ہے اور ان چاہتوں کا ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ چاہتوں کے بغیر زندگی ایسی ہے جیسے کہ دعاؤں کے بغیر عبادت۔ چاہتیں دراصل انسانی زندگی کی مختلف منزلیں ہیں جنہیں پانے کی خاطر وہ نت نئے راستے اختیار کر کے سفر طے کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی زندگی ہی نہیں ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے چاہتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جب معاملہ ایسی حساس نوعیت کا ہو تو کوئی

دورائے نہیں ہوسکتی ہیں کہ دل میں چاہتیں پالنے کے بھی لگے بندے اصول ہیں۔ دل میں پنپتی ہر چاہت انسانیت، اخلاق و اقدار، سیرت و کردار، مذہبی پاسداری، سماجی رواداری اور یکسانیت کے برعکس نہ ہوں۔ چاہتیں ایسی ہوں کہ جن کو پانے کے لیے دوسرے بھی اپنا سکھ چین چھوڑ کر ہماری مدد میں جٹ جائیں۔ ورنہ ایسی صورتحال پیدا ہوسکتی ہے کہ ہماری چاہتیں ادھوری کی ادھوری رہ جائیں گی اور زندگی جہنم زار بن جائے گی۔

......☆☆......

زندگی......!

جو کشتگان چمن نے لُوٹی

زندگی کو قریب سے جینے والا سنجیدہ فطرت انسان کبھی کبھی ان حقائق کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے کہ آخر چمکتے ستاروں کی قسمت میں ٹمٹمانا کیوں ہے؟ کیا چاند کسی کی چاہت کا طلب گار ہے کہ اُس کے سینے میں داغِ آرزو ہے؟ کیوں مچلتے طوفان سمندر کا سکون بر باد کر دیتے ہیں؟ کیوں عطر کبھی تیزاب بن جاتی ہے؟ کیوں شبنم کے موتی سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں؟ شمع کی چشمِ روشن سے ہمیشہ آنسو کیوں ٹپکتے رہتے ہیں؟ ثمر بار شاخ کی قسمت میں ہمیشہ پتھر کیوں لکھے ہیں؟ خزاں بہار کی رونقیں لُوٹ کر کیوں لے جاتی ہے؟ مچلتی جوانی کی گھات میں بڑھاپا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں حلقہ نور پر ظلمت کا شب خون ازل سے جاری ہے؟ کاشانہ عدل غاصبوں کے ہاتھوں مسمار کیوں ہو جاتا ہے......؟ ایسے ہی ان گنت سوالات کا قافلہ ایک ذہین شخص کے ذہن پر شب

وروز اترتا رہتا ہے۔

درحقیقت زندگی ایک ترازو کی مانند ہے جس کے دونوں پلڑے سانسوں کی نازک ڈنڈی سے آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔اگر ایک پلڑے میں خوشیاں آتی ہیں تو اگلے ہی پل دوسرے پلڑے میں غم ڈیرا ڈالتے ہیں۔ ہاں ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کس پلڑے میں کس لمحے کیا آجائے مگر زندگی کے دونوں پلڑے ہمیشہ متحرک رہتے ہیں۔

رب کائنات نے جب فرشتوں سے کہا کہ وہ کرۂ ارض پر انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بسانا چاہتا ہے تو فرشتوں نے جواب میں عرض کیا کہ کیا آپ زمین پر فساد بپا کرنے والی اور خون بہانے والی مخلوق کو بسانا چاہتے ہیں؟ مگر خداوند کریم نے اپنے فرشتوں سے واضح الفاظ میں فرمایا کہ بے شک میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جان سکو گے۔یعنی یہ راز تب کھل سکا اور نہ آج ہی عیاں ہے کہ انسان کو روئے زمین پر بسانے کا مدعا کیا تھا۔یہ صرف خالق کائنات جانتا ہے یا پھر زمین پر رہن سہن کرنے والے وہ چند خوش نصیب جنہوں نے اپنے رب کو پہچان کر تخلیق کائنات کا اصل راز پالیا ہے۔ بات عیاں ہے کہ انسان کو زمین پر بسانے سے پہلے ہی خون خرابہ اور فساد کی باتیں ہو چکی ہیں۔بہر حال خدا نے یہی طے کیا کہ کائنات کو سبزہ زاروں، آبشاروں، کوہساروں، چاند ستاروں، معدنیات وغیرہ سے آراستہ کر کے اس پر انسان کو بساؤں گا۔وہ کائنات کی سیر کرے گا۔ اِس کی رعنائیوں کو دل سے محسوس کرے گا اور آخر کار وہ اپنے خالق کو پہچان کر زندگی کا راز پالے گا۔

قدرت کی عطا کردہ انہی بے شمار سہولیات کے طفیل انسان اپنی زندگی کے زینے طے کرتا رہا۔پھر آہستہ آہستہ انسان ایک ایسے دور میں پہنچ گیا جہاں اس کی ذہنی صلاحیتوں میں نکھار آگیا قدرتی وسائل کے ساتھ ساتھ اس نے مصنوعی

سہولیات ایجاد کر کے اپنی زندگی کو اور بھی آرام دہ بنا دیا۔بس یہی اس کی بربادی اور تباہی کا نقطۂ آغاز تھا۔اپنے شب وروز کو آرام دہ بنائے رکھنے کی خاطر اب انسان ایک دوسرے کا حق مارنے پر بھی آ چکا ہے۔اور پھر حیرت ہے کہ اب انسان اس قدر دیدہ دلیر بن گیا ہے کہ اپنی خوشی کی خاطر کسی کی جان لینا بھی اس کی نظروں میں کوئی گناہ نہیں ہے۔دھن دولت کی ہوس،کرسی کی لت،سنگھاسن کا نشہ اور پر لطف چیزوں کی چاہ میں انسان ایک بھوکے بھیڑیے کی طرح انسان کے پیچھے پڑا ہے۔

اپنے اس مکروہ کام کو انجام دینے کے لیے انسان نے بہانے بھی بہت ہی خوبصورت تراشے ہیں۔تباہی و بربادی کا یہ کھیل وہ یا مذہب کے نام پر کھیلتا ہے یا بحالی امن کے نام پر۔بہر حال بہانہ کچھ بھی ہو ایک عام انسان قتل ہو رہا ہے، انسانیت کھلے عام مسلی جا رہی ہے۔ماں اپنی کوکھ میں بچے کی پرورش کرتے کرتے کتنے ہی آلام ومصائب جھیلتی ہے۔وھناً علیٰ وھن برداشت کر کے اپنے لختِ جگر کو جوان کرتی ہے۔جوان ہو کر اس کا بیٹا دو وقت کی روٹی کمانے نکلتا ہے۔بازار کی گہما گہمی میں فٹ پاتھ پر پھل سبزیاں بیچنا شروع کر دیتا ہے کہ اچانک یا تو بم پھٹ جاتا ہے یا پھر بندوقوں کے دہانے کھل جاتے ہیں۔شام کو اس جوان کے گھر کھانے کی روٹی نہیں بلکہ ٹکڑوں میں بٹی اُس کی لاش پہنچ جاتی ہے۔انسانوں کی بھیڑ دیکھ کر ہی کشتگان چمن گولیاں چلاتے ہیں۔انسانوں کو بلا لحاظ عمر یا جنس ایسے گرا دیا جاتا ہے کہ جیسے لکڑی کے بوسیدہ کھمبے ہیں جن کو اکھاڑ اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہو۔ماں جوان بیٹے کی واپسی کی آس لگاتے لگاتے آنکھوں کی بینائی کھو دیتی ہے،ہاتھوں میں مہندی لگائے نئی نویلی دلہن اپنے سہاگ کی دید کو ترس ترس کر مرجھا جاتی ہے۔کوئی معصوم بچہ اپنے گھر کی دہلیز پر باپ کی راہ تکتے تکتے پیوندِ غم

ہو جاتا ہے۔ کسی بہن کا محافظ بھائی بیچ بازار میں دہشت کی آگ سے یخ کی طرح پگھل کر معدوم ہو جاتا ہے اور اسی کو وہ لوگ اپنی کامیابی مانتے ہیں۔ جتنی سر بریدہ لاشیں اتنا ہی سنگدلوں پر انعام واکرام کی بارشیں۔ مگر فطرت کا تقاضا ہے کہ طاقت کے نشے میں اٹھنے والا ہر ہاتھ نیچے آجاتا ہے۔ انسان کو تخلیق کرنے والی ذات یہ کیسے برداشت کرے کہ انسان اس کا باغی بن کر اس کے سجے سجائے باغ کو اجاڑ دے۔ انسانیت کے ماتھے پر خود غرضی کی ضربیں لگانے والا دراصل خدائی طاقت کو للکار کر قہر الٰہی کو دعوت دیتا ہے۔

ذرا سا غور کیجئے کہ اگر انسان کے ہاتھ کبھی خدائی آجائے تو کیا ہوگا؟ انسانی حقوق کی کھلے عام دھجیاں اڑانے والے خدا بن بیٹھے تو عالم انسانیت کا کیا حال ہوگا؟ کمزوروں اور بے بسوں کا آج یہ حال ہے تو تب کیا ہوگا اگر ہوس پرست انسان کی دسترس میں ساری کائنات آجائے۔ چند اہم سوالات پریشان کر دیتے ہیں۔ آخر انسان کو انسان کا خون بہانے کی لت کیوں پڑی ہے؟ کیا معصوم انسانوں کا خون بہانے والے بھی انسان کہلائے جاسکتے ہیں؟ کیا انسان کو قتل کیے بغیر دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا ہے؟ انسان کی رحم دلی جواب کیوں دے چکی ہے کہ وہ انسانی سروں کو کچل کر ٹھنڈک محسوس کرتا ہے؟ انسان انسان کے بہکاوے میں آکر انسان کا خون کیوں بہاتا ہے؟ آخر یہ خونی کھیل کب تک چلتا رہے گا؟ کیا بے قصور انسان کی جان لینے والا اپنی ظالم حرکتوں پر کبھی پشیمان نہیں ہوگا؟ اب الجھن یہ ہے کہ ان سوالوں کا جواب کون دے گا؟ انسانی حقوق کے عالمی علمبردار، اقوام متحدہ، عالمی سلامتی کونسل یا پھر عالمی مذاہب کے پیشوا۔

کسی فلم یا ڈرامے کے عدالتی سین میں ہمیں اکثر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جب کسی قاتل کو واضح ثبوت ملنے کے بعد سزائے موت سنائی جاتی ہے تو موت

کے فیصلے پر جج صاحب اپنے دستخط کرنے کے بعد قلم توڑ دیتا ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ اس قلم کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ سزائے موت اس مجرم کو ملتی ہے جس نے عمداً کسی انسان کا قتل کیا ہوتا ہے۔ بات واضح ہے کہ ایک قاتل کا سر قلم کر دینا بھی ایک ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ پھر کیا کہیے کہ جرم بے گناہی میں کسی نہتے انسان کی جان لی جائے؟ استغفر اللہ! مچلتے ارمانوں بھرے انسانی سینے میں جب گولی لگ جاتی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ وہ بے قصور ہوتا ہے تو تصویر کائنات میں شگاف پڑ جاتے ہیں۔ بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی ہو یا روانڈا میں کانپتی انسانیت ہو، نیویارک کے ٹریڈ سینٹر کا کہرام ہو یا القائدہ کے نام پر بے گناہ افغانیوں پر بمباری کا ماتم ہو، دہلی اور گجرات کی آہ وفغاں ہو یا محصور فلسطینیوں کی ان سنی چیخ و پکار۔ مالیگاؤں کے خون میں نہلائے نمازی ہوں یا اڑیسہ کے بے گناہ عیسائیوں کی جلی کٹی لاشیں ہوں، پشاور کے فوجی سکول میں ننھے بچوں کی بکھری پڑی لاشیں ہوں یا ممبئی کی سڑکوں پر بہتا معصوم انسانوں کا لہو، پاکستان میں امریکی دہشت کے برستے بادل ہوں یا غزہ میں یہودی دہشت گردوں کا وحشیانہ پن ہو، نہتے کشمیریوں کی چھلنی چھاتیاں ہوں یا پاکستانی قبائلیوں کی سر بریدہ لاشیں۔ ہر واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسانی لہو کا پیاسا انسان چاہیے نبیوں کی سر زمین فلسطین سے ہو یا یہودی کالونی اسرائیل سے ہو، وہ ہندوستان سے ہو یا عرب سے ہو، بجرنگ دل کا کارکن ہو یا طالبان کا فدائی، بے گناہ انسانوں کو قتل کر کے وہ ایک عظیم گناہ کر رہا ہے جو بہر صورت قابل مذمت ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

ایک سمجھوتا

عام مشاہدے میں آیا ہے کہ جب دو سہیلیاں سکول و کالج سے فارغ ہوکر برسوں بعد زندگی کے کسی دوراہے پر اچانک مل جاتی ہیں تو منظر بڑا جذباتی ہوتا ہے۔ ایک آن میں دونوں سہیلیاں ایک دوسرے سے ان گنت سوال پوچھ بیٹھتی ہیں۔ کیسی ہو؟ نوکری ملی کہ نہیں؟ ممی پاپا کیسے ہیں؟ بچے کتنے بڑے ہو گئے ہیں؟ موٹی ہوگئی ہو اپنا خیال کیوں نہیں رکھتی ہو؟ وغیرہ وغیرہ......ایک سوال جس پر دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کا جواب سن کر اٹک جاتی ہیں وہ ہے، شادی کب کی اور زندگی کیسی جا رہی ہے؟ اس سوال کے جواب میں دونوں سہیلیاں باری باری اپنی کہانیاں سناتی ہیں۔ کہانیاں سنانے کے بعد دونوں اس بات پر متفق دکھائی دیتی ہیں کہ......"چلتا ہے۔ سب کچھ کہاں ملتا ہے۔ جو سوچا تھا وہ نہیں ملا اور جو وہم میں میں بھی نہیں تھا وہی سہنا پڑ رہا ہے۔ بس زندگی سے سمجھوتا کر رکھا ہے۔"......ہلکے

سے وقفے کے بعد "بچوں کی خاطر۔" اس اتفاق کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ جاتی ہیں۔ آنسو بہہ جاتے ہیں اور سرد آہوں سے ماحول میں مایوسی کی خنکی پھیل جاتی ہے۔

بات سے بات چلتی ہے۔ دو سہیلیوں نے واقعی سمجھوتا کیا ہوا ہے کہ نہیں اسے مجھے کوئی غرض نہیں۔ یہاں میں اس بات کی انتہا کو تھامتے ہوئے اپنے ذہن کے دریچے وا کر کے یہ سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوں کہ زندگی میں سمجھوتا کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ انسان سمجھوتا کسے کہتا ہے اور کرتا کیوں ہے۔ کیا زندگی کے فلسفے یا اصولوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا کسی لحاظ سے معتبر ہے؟

سمجھوتا کیا ہے؟ اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ دو فریقین کے بیچ چل رہی مخاصمت کو دور کرنے کے لیے ایک ایسا راستہ نکال لیا جائے جس پر دونوں فریق خوشی خوشی چلنے پر رضا مند ہوں۔ دوسرا یہ کہ سمجھوتا ہر وہ کام ہے جو ہم بعض اوقات قواعد و ضوابط کو نظر انداز کرتے ہوئے کرتے ہیں اور اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ مقصد صرف فائدہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی کام قواعد و ضوابط کے عین مطابق کیا جائے تو کسی بڑے نقصان کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ ایسا سمجھوتا تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک مکّاری، دوسرا مجبوری اور تیسرا حکمت۔ دنیا پرست امیر لوگ سمجھوتا کریں تو وہ مجبوری نہیں مکاری ہوتی ہے۔ جب کہ بے کس و بے سہارا غریب لوگ سمجھوتا کرتے ہیں تو مجبوری کی وجہ سے۔ تیسرے قسم کے سمجھوتے کی مثالیں تاریخ میں کئی ملتی ہیں۔ یہ وہ سمجھوتے ہیں جو وقت وقت پر اصولوں کو نظر انداز کر کے کسی بڑی کامیابی کی خاطر کیے گئے۔ ایک نہایت ہی عمدہ مثال پیغمبرِ آخر الزمان ﷺ کا وہ سمجھوتا ہے جسے تاریخ صلحِ حدیبیہ کے نام سے جانتی ہے۔ رسالت کے ساتھ وقتی سمجھوتا ان کے لیے فتح نصرت کے دروازے بغیر کسی جنگ و جدل کے کھولتا گیا جو

اس سمجھوتے سے قبل ناممکن دکھائی دیتا تھا۔

چنانچہ انسان دنیا میں آیا ہے۔اسے زندگی ملی ہے تو اسے جینا بھی ہے۔ زندگی جیتے جیتے انسان کو اپنی آرزوؤں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔اُسے اپنی قسمت کی لکیروں کو سنوارنے کے لیے عرق ریزی کرنی ہوتی ہے۔اسے اپنے خوابوں کی تعبیر کھوجنی ہوتی ہے۔اسے اپنوں میں پیار بانٹنا ہوتا ہے اور ان سے پیار لینا بھی ہوتا ہے۔وقت آنے پر اسے غم سے رشتہ جوڑنا پڑتا ہے اور مصیبتوں سے سبق لینا پڑتا ہے۔قسمت کے ہر رخ میں اس کا امتحان پوشیدہ ہوتا ہے۔اسے اقتدار ملے تو اس کی شرافت کا امتحان ہے۔اسے افلاس نصیب ہو تو اس کی استقامت کا سوال ہے۔اسے اجالا مل جائے تو اس کی ظاہری آنکھ کا امتحان ہے اور اندھیرا مقدر میں ہو تو اس کی باطنی بصارت کی آزمائش ہے۔جب ایک طالب علم امتحان ہال میں اپنی قابلیت کا امتحان دیتا ہے تو یہی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ایمان داری کے ساتھ سمجھوتا نہ کرتے ہوئے کوئی غلط طریق کار نہ اپنائے۔پھر جو کامیابی اسے ملے گی اس پر وہ خوش ہوگا اور نازاں بھی۔اسی طرح زندگی کے امتحان ہال میں انسان آزاد گھوم رہا ہے۔اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے زندگی کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر ایک مذموم طریق کار اپنا لیا ہے۔اور وہ یہ کہ اس نے اصولوں کے ساتھ سمجھوتا کیا ہوا ہے۔زندگی کے ہر قدم پر سمجھوتا۔خدا پر ایمان ویقین کی بات آئے تو سمجھوتا،عبادات کی بات آئے تو سمجھوتا،دین کی پاسداری یا آبیاری کی بات ہو تو سمجھوتا،احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کی بات چلے تو سمجھوتا۔سمجھوتے کرتے کرتے وہ مسلمان سے روشن خیال مسلمان بن گیا۔ وہ دین دار سے سیکولر بن گیا۔وہ سمجھوتا کر بیٹھا تو نماز ورزش بن گئی۔اُس نے سمجھوتا کیا تو روزہ وزن کم کرنے اور کولسٹرول گھٹانے کا ذریعہ بن گیا۔وہ سمجھوتا کر بیٹھا تو

امامت اور دعوت و تبلیغ کا کام ایک بہترین ذریعہ آمدن بن گیا۔ یہ سمجھوتا ہی ہے کہ خیراتی ادارے، یتیم خانے اور دینی تعلیم کے مدارس سونے کی چڑیا بن گئے۔ گویا زندگی کا نام ہی سمجھوتا رکھ دیا۔

بہادر لوگ کبھی سمجھوتا نہیں کرتے۔ وہ اگر صاحب اقتدار ہوں تو اپنے ذاتی فائدے کی خاطر قانون کے ساتھ کبھی چھیڑ خوانی نہیں کرتے ہیں۔ کسی دباؤ میں آجائیں تو اقتدار چھوڑ دیتے ہیں لیکن اصولوں کے ساتھ سمجھوتا نہیں کرتے۔ اور اگر بہادر لوگ ایک عام انسان کی زندگی گزار رہے ہوں تو بھی سمجھوتا نہ کر کے اپنے باغیرت ہونے کا ثبوت دے دیتے ہیں۔ وسائل و ذرائع نہ ہونے کے باوجود وہ اپنی ہمت اور اپنے اصولوں کے بل پر تن تنہا آخری وقت تک زمانے کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں لیکن سمجھوتا نہیں کرتے۔

سمجھوتا ہر بار غلط نہیں ہوتا۔ جب سمجھوتا صحیح ہوتا ہے اور ناگزیر ہوتا ہے تب زندگی کی کہانی بڑی ہی دکھ بھری بن جاتی ہے۔ صرف امیر لوگ عیاشیوں کی خاطر اصولوں کے ساتھ سمجھوتے نہیں کرتے۔ غریب اور مفلس لوگ بھی زندگی میں کئی سمجھوتے کر کے دن کاٹ لیتے ہیں۔ جہاں لگے بندھے اصولوں کے تحت محبت ملنی چاہیے وہاں بے آسرا لوگ نفرت کے ساتھ سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ دوست نہ ملے تو دشمنوں کے ساتھ دوستی نبھانے کا سمجھوتا۔ ایسے لوگ وفا کی تلاش میں ہوتے ہیں لیکن وفا کو تو دولت مندوں نے خرید کر اسے غریبوں کے لیے حرام کر دیا ہے۔ پھر وہ سمجھوتا کر کے جفا کو قسمت کی ایک سوغات سمجھ کر اپنی زندگی گزارا کر لیتے ہیں۔ یتیم بچہ کسی اجنبی کا ندھے پر سر رکھ سکون محسوس نہیں کر پاتا ہے تو اسی اجنبی کاندھے کو اپنے باپ کا شفقت بھرا کاندھا سمجھ کر وہ اس پر اپنے خوابوں کے محل سجاتا ہے۔ سمجھوتا ایک تلخ اشی سمجھوتا انصاف کے متلاشی بے سہارا لوگ جب

عدل وانصاف کے علمبرداروں کے ضمیر جھنجوڑنے کے بعد بھی انصاف سے محروم رہ جاتے ہیں تو وہ اسے اپنا مقدر سمجھ کر ہمت ہار جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا غم پھر ان کا ہمدرد بن کر ان کی ڈھارس بندھاتا ہے۔

ہاں اگر سمجھوتا کرنا انسان کی عادت بن چکا ہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی عادت بدلے اور اگر عادت سے مجبور ہے تو سمجھوتا اپنی انا کے ساتھ کرے، خودغرضی اور لالچ کے ساتھ کرے، نفرت و کدورت کی اُس قبیح خصلت کے ساتھ کرے جو اُس کے من کی روشنی پر حاوی پڑ جاتی ہے، دنیا پرستی کے اس مشغلے کے ساتھ کرے جو اُس سے اُس کی زندگی کا مقصد چھین لیتی ہے، اقتدار کے اُس نشے کے ساتھ کرے جو اُسے غرور اور تکبر کی خلعت پہنا دیتا ہے یا پھر اُن فانی لذّتوں سے کرے جو اُسے انجامِ کار انسانی خلعت اتار پھینکنے پر آمادہ کر دیتی ہیں۔

حاصل گفتگو یہی ہے کہ اصولوں کے ساتھ سمجھوتا ایک اخلاقی جرم ہے جو اگر بڑے لوگ کریں تو گناہِ عظیم بن جاتا ہے کیونکہ ان کے سمجھوتے کی کوکھ سے ظلم بربریت کی لرزا دینے والی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ اور اگر کمزور لوگ کریں تو بے غیرتی کی مثال بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے قاعدہ یہی ہے کہ آخری سانس تک اپنے حق کی خاطر غلط کرنے والے خلاف ڈٹے رہیں۔ ہاں اگر سمجھوتے کا مقصد انسانیت کی بقا اور احترام، عدل وانصاف کا بول بالا، سماجی اور معاشی خوشحالی یا پھر کوئی بھی ایسا کام ہو جو مجموعی طور پر سماجی اقدار کا ضامن بن جائے تو یہی سمجھوتا ایک عظیم حکمت عملی کا نام دھار کر ایک خوبصورت اور میٹھا لفظ بن جاتا ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

خوف بھی ہے

یہ گھر گھر کی کہانی ہے کہ کسی اچھے برے موقعے پر بہن بھائیوں کے بچے ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو ان کی ہڑبونگ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔دالانوں میں بچھے قالین ہوں یا درودیوار پر لٹکتے ریشمی پردے،قیمتی گاؤتکیے ہوں یا ڈرائنگ روم کا فرنیچر،بجلی کے قمقمے ہوں یا رسوئی میں سجی کراکری،داداجی کی دوائیاں ہوں یا دادی اماں کا چشمہ،برآمدے میں سجے گلدان ہوں یا گاڑی کا گیراج،کوئی بھی چیز اُن کے کومل ہاتھوں کی قہر سامانیوں سے محفوظ نہیں رہتی ہے۔بچے تو ایک الگ دنیا کے باسی ہوتے ہیں جہاں کے قوانین اُن کی مرضی کے مطابق طے پاتے ہیں۔ بھوک پیاس یا تھکان جیسی باتیں وہاں ہوتی ہی نہیں۔اُن کی معصوم کلکاریاں اُن کی غذا ہیں اور دھول مٹی سے ان کی پیاس بجھتی ہے۔اکثر لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ بچوں کے اس کھیل میں کوئی شرارتی بچہ دروازے کی بغل میں یا پردے کے

اوٹ میں رہ کر دوسرے بچوں کو ڈرانے کے لیے ہیبت ناک آواز نکالتا ہے۔ بچے خوف کے مارے سہم جاتے ہیں حالانکہ اغل بغل میں کوئی دشمن ہوتا ہے اور نہ کوئی وحشی جانور۔ پھر بھی خوف کے مارے بچوں کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ ڈرانے والا بچہ جب فاتحانہ انداز میں سامنے آ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے تب بھی بچوں کو سنبھلنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ کئی بچے تو کھیل چھوڑ کر اپنے ممی پاپا کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیوں اپنائیت کے ماحول میں بھی بچہ ڈر جاتا ہے۔ بس معیار کی بات ہے ورنہ بچہ کیا بالغ کیا، ہر کوئی کسی نہ کسی طرح کا خوف محسوس کرتا ہے۔

دراصل انسان بہت ساری جبلّتیں ودیعت میں لاتا ہے۔ خوف، حسد، محبت، غصّہ، نفرت وغیرہ زندگی کی وہ حقیقتیں ہیں جنہیں وہ مرتے دم تک ایک وفادار ساتھی کی طرح ہمیشہ اپنے وجود میں تحلیل پاتا ہے۔ ماں کی کوکھ سے جنم لے کر ماں کی گود میں آتے ہی انسان خوف محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپنے والدین اور دوسرے افرادِ خانہ سے وہ آہستہ آہستہ مانوس ہو جاتا ہے اور اُسے ایک بھروسہ ملتا ہے جس کی بنیاد پر وہ خوف کو اپنے دل سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر ماہ وسال جیتے جیتے وہ بالغ ہو جاتا ہے۔ بالغ ہوتے ہی وہ اس بات کو محسوس کر لیتا ہے کہ اُس کے دل میں کئی ایسے خوف پنپنے شروع ہو جاتے ہیں جنہیں اُس کے والدین مٹا سکتے ہیں اور نہ دوست واحباب۔ اپنوں سے بچھڑ جانے کا خوف، اپنوں کی جدائی کا ڈر، خوشیوں کو پانے کا خوف اور پا کر ان پر غموں کے حملے کا خوف وغیرہ۔

جب زندگی میں ساری چیزیں مل جاتی ہیں تو زندگی زرنگار بن جاتی ہے

لیکن ساتھ ہی ایک بڑا خوف ستانے لگتا ہے۔موت کا خوف۔ جی ہاں جب زندگی پرسکون اور پر تعیش گزرنے لگتی ہے تو موت کے دبے پاؤں آنے کی آہٹیں کانوں میں گونجنے لگتی ہیں۔ بھلے ہی موت آس پاس نہ ہو لیکن یہ اُس کا خوف ہی ہے کہ زندگی پیاری لگنے لگتی ہے ورنہ زندگی سے کوئی اتنا پیار نہیں کرتا۔ دیکھا جائے تو انسان کی ساری زندگی خوف کے سائے میں گزرتی ہے۔خوف کئی طرح کے ہیں۔ ایک طبعی یعنی وہ خوف جو عیاں ہوتا ہے اور ہر کوئی اسے محسوس کرسکتا ہے کیونکہ اس خوف کے مارے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔مثلاً دشمن کا وار، وحشی جانوروں کا حملہ، رقیبوں کی للکار، قدرتی آفتوں کا قہر یا ہر وہ ڈر جو جان لے سکتا ہے اگر اسے بچا نہ جائے۔خوف کے مارے بادشاہوں نے اونچی فصیلوں والے قلعے تعمیر کیے، سرنگیں کھدوائیں اور قسم قسم کے مہلک ہتھیار بنوا ڈالے لیکن جس چیز کا خوف انہیں یہ سارے کام کروا گیا وہ جب آگئی تو قلعے کام آگئے اور نہ تدبیریں یا ہتھیار۔

دوسرا خوف نفسیاتی ہوتا ہے۔یہ باطنی خوف ہوتا ہے۔اس خوف کا اظہار انسان کرنا چاہتا ہے اور نہ کرسکتا ہے۔مثلاً بے عزت ہوجانے کا خوف، انا کو ٹھیس پہنچنے کا ڈر، شہرت اڑ جانے کا خوف، اپنا فائدہ سلب ہو جانے کا خوف یا پھر غربت اور مفلسی کا ڈر۔یہ سارے خوف ایسے ہیں کہ دل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ بے قراری اور مایوسی دل کے اجالوں کو تاریک زدہ کر دیتے ہیں لیکن جان سلامت رہتی ہے۔ جان تو ویسے سب سے قیمتی مانی جاتی ہے لیکن ایسے خوف کے ہوتے جان کی چاندنی ماند پڑ جاتی ہے اور زندگی پھیکی سی لگنے لگتی ہے۔

تیسرا خوف روحانی خوف ہے۔روح کی تازگی مرجھا جانے کا خوف، ضمیر کشی کا خوف یا انانیت سوار ہونے کا خوف ایسے خوف ہیں جو پارسائی کے دشمن ہیں۔جس انسان کے پاس ایمان و ایقان، زہد و تقویٰ اور انسان دوستی کی بے پناہ

دولت ہوتی ہے اسے ہر وقت یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ کہیں شیطانی قوتیں اس کی جاہ حشمت پر شب خون نہ ماردیں حالانکہ اس کے پاس عبادت گزاری کی مضبوط ڈھال ہوتی ہے پھر بھی وہ خوف سے خود کو آزاد نہیں سمجھتا۔ دیکھا جائے تو انسانی زندگی پر طبعی خوف کے مقابلے میں نفسیاتی خوف زیادہ اثر انداز ہوجاتا ہے۔ جان گئی تو گئی۔ ایک بار گئی تو پھر کوئی خوف ستانے کی ہمت نہیں کرسکتا لیکن نفسیاتی خوف کے مارے انسان ہر گزرتے لمحے میں سینکڑوں بار مر جاتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ طبعی خوف کا توڑ ممکن ہے لیکن لاکھ جتن کیے جائیں نفسیاتی خوف سے بچنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ ہاں ایسے خوف سے انسان مانوس ہوکر بے خوف ہوسکتا ہے مگر بے خوفی کا وہ دور بھی خوف کے سائے میں ہی گزر جاتا ہے۔

خوف کی کئی خوبیاں بھی ہیں۔ خوف ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے ذہن کو تحقیق اور کھوج کی تحریک دیتا ہے۔ موت سے بچنے کی خاطر انسان نے دن رات ایک کرکے ایسی ادویات دریافت کیں جو معجزے دکھا گئیں۔ روحانی خوف انسان کو اپنے خالق کے قریب تر کر دیتا ہے اور ساتھ ہی آخرت کی سلامتی کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ نفسیاتی خوف انسان کو خوش اخلاق اور خوش گفتار بنا دیتا ہے۔ جان جانے کے خوف نے انسان کو قلعے اور اونچی اونچی فصیلیں بنانے پر اکسایا۔ بیشتر خوف انسان نے خود کے مسلط کیے ہوئے ہیں لہٰذا ان سے آزادی بھی انسان خود کو خود ہی دلا سکتا ہے۔ زندگی اور خوف کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ زندگی ہے تو خوف ہے اور خوف ہے تو زندگی کے ہونے کا احساس ہو جاتا ہے۔ کیا انسان بغیر خوف کے زندگی جی سکتا ہے؟ نہیں۔ ہر گز نہیں۔ ہاں ایک صورت یہ ہے کہ ماہرین نفسیات کے وضع کردہ اصولوں کے تحت انسانی جبلتوں، بشمول خوف، کی اگر تربیت

کی جائے تو یہی خوف انسان کی کمزوری نہیں بلکہ ایک گُر سمجھا جائے گا۔

آج تک ایسا کوئی انسان نہیں جنما ہے جو خوف سے آزاد ہو۔خوف انسان کی ودیعتی خصلت ہے۔یہاں یہ بات قابل بحث ہے کہ جب خوف انسان کی سرشت میں ہے تو پھر ڈرنا لازمی ہے۔ایسی صورتحال میں بھلا ایک عام انسان کیا کرسکتا ہے۔یہیں پر تربیت کی بات آجاتی ہے۔انسانی جبلّتوں کی بالکل اسی طرح پرورش و تربیت کرنی ہے جس طرح کہ انسان کی جسمانی پرورش کی جاتی ہے۔خوف کے حوالے سے یہ تربیت کرنی ہے کہ انسان کو سکھایا جائے کہ جب اسے ڈرنا ہی ہے تو خدا سے ڈرے۔قدرت کے عذاب سے ڈرے۔مظلوم کی آہ سے ڈرے۔یتیم کے نالوں سے ڈرے۔ماں کی بددعا سے ڈرے۔قبر کے عذاب سے ڈرے۔اسے سیکھنا ہے کہ کس طرح اپنے من میں قیامت کی گھڑی کا خوف پال رکھے۔انسان ہمیشہ اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں انسانیت کی خلعت اس کے وجود سے اتر نہ جائے اور وہ ننگا پھرتا رہے۔

......☆☆......

زندگی......!

پارسائی بھی ہے

زندگی میں شاید ہی کوئی انسان ایسا ہوگا جو اپنی جسمانی نشو نما کے لیے سنجیدہ نہ ہوگا۔ اگر انسان کبھی اس چیز کو نظر انداز کر بھی دے تو پیٹ غرانے لگتا ہے اور ایک دم انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ بھوکا ہے اور یہ کہ اگر فوراً اس نے بھوک مٹانے کی سنجیدہ کوشش نہ کی تو اس کے مریض ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ انسان بغیر کسی تامل کے اپنے شکم کے نالے سنتے ہی اس حقیر آقا کی غلامی میں جٹ جاتا ہے۔ شکم سیر ہو جاتا ہے تو ہی خود کو فارغ سمجھتا ہے۔ یوں ایسی غلامی کرتے کرتے انسان کا جسم فربہ ہو جاتا ہے۔ اپنے مضبوط پٹھے اور دیگر چست اعضا دیکھ کر انسان ایک سکون بخش اطمینان پاتا ہے۔ اپنے نفس کے ہر حکم کی عمل آوری کرنا یا یوں کہیے کہ اپنے تن بدن کی دیکھ ریکھ اور بناؤ سنگار کرنے کی غلامی ایک ایسی غلامی ہے جس کی زنجیر میں انسان تب تک جکڑا رہتا ہے جب تک اس

کی زندگی کی ڈور سلامت ہے۔ایک زاویے سے دیکھا جائے تو کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ غلامی نہیں مجبوری ہے کیونکہ زندہ رہنے کے لیے جسم کو توانا رکھنا لازمی ہے۔ سائنسی اعتبار سے تو یہ بات طے پا چکی ہے کہ صحت مند دماغ پانے کے لیے صحت مند جسم ایک لازمی شرط ہے۔انسانی شریر میں ذرا سا ضعف پیدا ہو جائے تو دماغ کے دیے کی لو ماند پڑ جاتی ہے اور انسان اندھیرے میں بھٹکا ہوا ایک ایسا راہی بن جاتا ہے جو روشنی کو ترستے بس ٹھوکریں کھائے جاتا ہے۔جسم میں پانی کی کمی، نمکیات کی کمی،خون کی کمی یا کسی اور چیز کی کمی انسان کی ظاہری شکل وصورت پر ایسے اثر انداز ہو جاتی ہے جیسے جڑیں کٹے ہوئے پودے پر جھلساتی دھوپ۔

زندگی کیا ہے؟ دراصل یہ مٹی کے پتلے میں حرکات وسکنات پر انسان کی قدرت کا نام ہے۔سائنس بھلے ہی اُسے کچھ اور نام دے لیکن یہ طاقت، جس کی بنیاد پر انسان ایک طرف زمین کو چیر رہا ہے اور دوسری طرف آسمان کی وسعتوں اور بلندیوں کو چھو رہا ہے،اصل میں انسان کے پیکر خاکی میں ایک نہایت ہی بیش قیمت چیز بسی ہوئی ہے جسے ہم روح کہتے ہیں۔جس طرح جسم کی نشونما لازمی ہے بالکل اسی طرح روح کی پرداخت اور نگہداشت بھی لازمی ہے۔افسوس ہے کہ چند خوش نصیبوں کو چھوڑ کر انسان اپنے جسم میں بس رہی روح کو تب تک مسلسل نظرانداز کرتا ہے جب تک کہ وہ اس کے جسم سے نکل کر عالم ارواح کو ہو نہیں لیتی۔ جب جسم سے روح نکل کر انسان گوشت پوست کا ایک لتھڑا بن کر پیوند خاک ہو جاتا ہے تب اس کے پاس کوئی قوت ہوتی اور نہ موقع کہ وہ روح کو واپس اپنے بے جان جسم میں ڈال کر اس کی خدمت میں لگ جاتا۔زندگی جینے کے لیے ایک مخصوص مدت ہوتی ہے۔اسی مقرر کردہ وقت میں انسان اپنی روح کو فربہ اور توانا بنا سکتا ہے۔جہاں جسم کو فرحت اور توانائی بخشنے کے لیے خداوند تعالیٰ نے انسان

کے گرد و پیش میں بے شمار وسیلے مہیا کر رکھے ہیں وہاں روح کو سنوارنے کے لیے اُس نے انسان کے پاس اپنے نبی اور پیغمبر بھی بھیجے۔ خدا اپنے نبیوں کے ذریعے آدم زاد کو حدود و قیود میں رہ کر زندگی گزارنے کے قواعد و ضوابط سمجھاتا آیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر اچھے برے دور میں جسم ہی انسان کی ترجیح رہی ہے۔ روح اپنے لاغر پن پر چونکہ نفس کی طرح بدزبان ہو کر چیختی چلاتی نہیں لہٰذا اس کو پالنے پوسنے میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ انسان کو جب موت آتی ہے تو جسم خواہ کتنا ہی تنومند اور سجا سنورا کیوں نہ ہو، خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے جب کہ روح کو موت نہیں آتی۔ روح جسم سے نکل کر سیدھے عالم ارواح میں پہنچ جاتی ہے۔ بڑی غیر دانشمندی کی بات ہے کہ جو چیز فنا ہو جاتی ہے اس کے لیے انسان زندگی بھر فنا ہوتا رہتا ہے اور جو چیز لافانی ہے اس کی خاطر انسان ایک چھوٹی سی مصیبت سہہ لینے کے لیے بھی تیار نہیں۔

تخلیق آدم سے لے کر آج تک جتنے بھی نیک انسان صفحۂ ہستی پر نمودار ہو چکے ہیں وہ لافانی روح کے لیے فناہ ہوتے رہے۔ روح کو سنوارنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کے قریب ہو جاتا ہے، اسے پہچانتا ہے، اسے سمجھتا ہے اور اسے باطنی طور پر دیکھ بھی سکتا ہے۔ بس پھر کیا......! جب انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں وہ قرب الٰہی سے فیضیاب ہو جائے تب وہ ایک ایسی قوت بن جاتا ہے جس کے سامنے کسی بھی طرح کی طاقت ہیچ ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ روحانی طاقت ایک ناقابل تسخیر طاقت ہوتی ہے جو فرشتوں کو انسان کو سجدہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، جو فرعون کو غرق آب کر دیتی ہے، جو آگ کے لپکتے شعلوں میں پھولوں کی نرمی اور مٹھاس پیدا کر دیتی ہے، جو بازار میں بکے ہوئے ایک غلام کو کنعان کا شہنشاہ بنا دیتی ہے، جو ایک ناتواں بچے کو شیر خدا بنا دیتی ہے،

جو ایک بشر کو عرش کی ان بلندیوں میں لے جاتی ہے جہاں فرشتے پر نہیں مار سکتے۔

اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کرے کہ آج کا انسان بے اطمینانی کا شکار ہے۔ ہر چند کہ اس کے پاس آسائش کا ہر سامان موجود ہے، وہ زندگی جینے میں ایک عجیب قسم کی گھٹن محسوس کر رہا ہے۔ وہ مسکرانے کو ترستا ہے، میٹھی نیند کی تلاش میں ہے، محبت کا متلاشی ہے، انسان ہو کے انسانیت کو ڈھونڈ رہا ہے یا پھر اپنے وجود میں کھوئے ہوئے اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ اس نے اپنی ترجیحات کو بدل دیا ہے۔ جسم کو روح پر فوقیت دے کر روح کا سکون ڈھونڈ نا سراسر نادانی ہے۔ یہ ایسا ہوا کہ کوئی سمندر کے کھارے پانی میں مٹھاس کی تلاش میں جٹ جائے۔ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود انسان ایک ایسی تخلیق کے روپ میں ابھر کر سامنے آیا ہے جو جانوروں کی طرح ہر بندش سے آزاد ہے۔

جسم دنیا کے لیے ہے۔ جسم فانی ہے اور دنیا بھی۔ روح آخرت کے لیے ہے۔ روح لافانی اور آخرت بھی۔ لیکن انسانی عقل کی پستی کی انتہا یہ ہے کہ فانی دنیا میں شہرت، عزت اور عظمت کمانے کے لیے انسان جانوروں کی طرح ایک بے ہنگم دوڑ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہے۔ دنیوی خوشحالی کا غم اُسے ہے لیکن آخرت کی خوشحالی کی فکر اسے کبھی نہیں ستاتی ہے۔ یہ بات بھی وہ نظر انداز کر چکا ہے کہ آخر بے شمار پیغمبروں کو انسان کے پاس بھیج کر خدا اس سے چاہتا کیا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت اس حوالے سے ایک واضح ثبوت ہے کہ ہمارا خالق چاہتا ہے کہ ہم اُس کی دی ہوئی زندگی کو اُسی کے بتائے ہوئے ضابطوں کے تحت جی لیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ ہم جسمانی نشو نما کے ساتھ ساتھ روحانی نشو نما کا بھی باقاعدہ اہتمام کریں۔ تن درستی کے لیے جہاں قدرتی وسائل موجود ہیں وہاں من درستی کے لیے بھی غذا

مہیا ہے۔ لاتعداد پیغمبروں کی زنجیر اور الہامی کتابوں کا نزول روح کو سنوار کر رضائے الٰہی حاصل کرنے کے ایسے وسائل ہیں جو ہمہ وقت مہیا ہیں اور ایسے وسائل جتنا استعمال کیے جائیں اتنا ہی بڑھ جاتے ہیں۔

تاریخ انسانی پر نظر ڈالیں تو صرف ان ہستیوں کا ذکر معتبر مانا جاتا ہے جو پارسا تھیں۔ انبیا، اولیا، علما، شہدا یا ایسے سارے اشخاص جنہوں نے جسم پر روح کو فوقیت دے کر رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کی عملی تفسیر پیش کی۔ یہ وہ خدا کے بندے تھے جنہوں نے اپنے نفس کو اپنی روح کی طاقت کے سامنے سرنگوں رکھا تھا۔ دنیوی رنجشوں اور ابلیسی مغالطّوں سے بارہا ان کی روح مضمحل ہوجاتی لیکن ان کی روح کے لیے یہ ایک قوت بخش تکلیف ثابت ہوجاتی۔ ایسی روحانی شخصیات اپنے خالق سے جب جا ملیں تو جسم مضروب تھا اور روح مجروح۔ یہی ان کی کامیاب زندگی گزارنے کا ثبوت تھا۔ اسی پس منظر میں علامہ اقبال کہتے ہیں:

تو اسے بچا بچا کے نہ رکھ، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دنیوی اعتبار سے آج کا انسان بہت ہی خوشحال ہے لیکن اس کی زندگی میں جس چیز سے رونق ہے وہ ہے روح جو اگر ایک بار جسم سے جدا ہوگئی تو زندگی رہتی ہے اور نہ اس کا سحر انگیز رنگ و روپ۔ سب کچھ اس کے پاس ہونے کے باوجود وہ کسی چیز کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے لیکن فناہ ہونے والی لذتوں سے کبھی اسے فرصت ملتی تو وہ ضرور غور کرتا کہ اس کی بے قراری کی وجہ کیا ہے۔ پھر وہ یہ راز پالیتا کہ دنیا بسانے کے ساتھ ساتھ اسے روح میں پڑی سلوٹوں کو سنوار کر نکھارنا بھی ضروری ہے۔ ایک بار اپنے آپ سے یہ عہد کرلیا کہ اس کے جسم کے اندر رچی بسی روح کے دم سے ہی اس کی زندگی کی قدر و قیمت ہے تو قرآن و

سنت کے عظیم روحانی وسائل پر عمل پیرا ہوتے ہی اس کے روح کی سلوٹیں ایسے کھلنے لگیں گی جیسے گیلے دھلے کپڑے پر گرم استرا پھیرنے سے اس کی سلوٹیں پھیل کر دور ہوجاتی ہیں۔ یہی کامیاب زندگی کا راز ہے اور یہی توشۂ آخرت بھی ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

ایک ڈھلتا سورج

بچپن میں اکثر اوقات اپنے بزرگوں سے یہ سننے کو ملتا کہ ''...... میرا کیا بھروسہ میں تو ڈوبتا سورج ہوں۔'' اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو پاٹتے پاٹتے جب میں نے اس بات پر غور کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی طلوعِ آفتاب سے لے کر اس کے غروب ہو جانے تک کا سفر انسانی زندگی کے سفر کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔ طلوعِ آفتاب بچپن ہے، دوپہر جوانی ہے، سہ پہر ادھیڑ عمری ہے اور غروبِ آفتاب بڑھاپا ہے۔ سورج کو سفر کے لیے وسیع و عریض آسمان ہے جب کہ انسان کو زندگی کے سفر کے لیے وسیع و عریض کائنات ہے۔

سورج کی زندگی کا پہلا پڑاؤ بہت ہی خوشگوار ہوتا ہے۔ جب سورج اس دور میں اپنے دن بھر کے سفر کا آغاز کرتا ہے تو نیلے گگن کے تلے اڑتی پھرتی رنگ برنگی تتلیاں، خوش الحان پرندے، جنگلی جانور اور انسان کاروانِ زیست میں شامل

ہونے کے لیے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔اپنی تمازت اور ترش روئی کی پہچان رکھنے والے سورج کا رنگ یہاں سنہرا ہوتا ہے۔اس کی رفتار دھیمی ہوتی ہے۔اس کا انداز معصومانہ ہوتا ہے۔اس کا مزاج نرم ہوتا ہے۔اس کی کرنیں ننھے بچے کی طرح شبنم کی موتیوں کے ساتھ ٹکرا کر کلکاریاں کرتی ہیں۔یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ رات بھر کے سکون کے بعد صبح ہر چیز تازہ بہ تازہ ہوتی ہے۔ بادِ صبا کے لطیف جھونکے جن میں گلوں کی مہک کی آمیزش ہوتی ہے اس فرحت بخش تازگی میں اضافہ کر کے سورج کے اس دور کو خوشگوار بنا دیتے ہیں۔سورج کے اس دور کی دھوپ بڑی میٹھی ہوتی ہے۔

زندگی کی گہما گہمی کے بیچ سورج اگلے دور میں پہنچ جاتا ہے۔دوپہر والا دور۔ایک ایسا حرارت بھرا دور ہوتا ہے جس کے لیے سورج جانا جاتا ہے۔یہی وہ حرارت ہے جو چاول یا گندم کے خوشوں کے خزانے بھر دیتا ہے۔ جو پہاڑی ڈھلانوں پر مکئی کے لہلہاتے کھیتوں میں جان ڈال دیتا ہے۔جو بے شمار نباتات و جمادات کی زندگی کا ضامن ہوتا ہے۔یہی وہ دور ہوتا ہے جس میں سورج کی بادِ صبا کی آمیزش لیے وہ سنہری کرنیں آگ برساتی ہیں۔ اس میں غصہ ہوتا ہے، حرارت ہوتی ہے،حرارت کا نشہ ہوتا ہے، جوش و جذبہ ہوتا ہے، بلند عزم و ارادے ہوتے ہیں۔یہی دور اس کی جوانی کا دور ہوتا ہے اور اسے جو کمالات دکھانے ہوتے ہیں اسی دور میں دکھاتا ہے۔

اگلا دور سہ پہر کا ہوتا ہے۔اس دور میں آتے ہی سورج دھیرے دھیرے محسوس کر لیتا ہے کہ اس کا دم خم عارضی ہے۔اس کی دوپہر والی حرارت اگرچہ ابھی باقی ہوتی ہے لیکن اس میں ضعف داخل ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں ہمت کام کرتی ہے جب کہ طاقت زوال پذیر ہوتی ہے۔پھر دیکھتے دیکھتے سورج اس دور سے بھی گزر

کر ایک ایسے دور میں آجاتا ہے جہاں وہ اپنا سارا مال و متاع کائنات کی تزئین و آرائش اور اس کے دوام کی خاطر لٹا کر خالی ہاتھ مغربی افق پر واپس تاریکی کی کوکھ میں جانے کی تیاری میں ہوتا ہے۔ غروب ہوجانے کا دور تو ہمت اور طاقت دونوں سے خالی ہوتا ہے لیکن یہاں زندگی کے گزرے ادوار سے حاصل شدہ تجربہ کام آتا ہے۔ ابھی تک سورج نے بے شمار چاند ستاروں کو اپنی روشنی سے منور کیا ہوتا ہے اور یہ نور شب کی تاریکی چھاتے ہی نیلے آسمان پر لاکھوں کروڑوں جگمگ ستاروں کی شکل میں چھلک جاتا ہے۔ یوں سورج تاریکی میں دفن ہونے کے بعد بھی اپنے ہونے کا ثبوت چھوڑ جاتا ہے۔

انسان کی زندگی اور سورج کے سفر کا اگر ہم موازنہ کریں تو دونوں کے سفر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ماں کی اندھیری کوکھ سے جب انسان جنم لیتا ہے تو سورج کی سنہری شعائیں انسانی روح میں جھانک کر اسے یہ نوید سناتی ہیں کہ اٹھو تمہاری نئی زندگی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ انسان جاگ جاتا ہے اور انگڑائیاں لیتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں میں اپنے وجود کو نہلاتا ہے۔ فرحت بخش تازگی کا احساس ہوتے ہی اسے اپنی زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے۔ اس کی پیار بھری زندگی کا یہ دور بڑا ہی سہانا ہوتا ہے۔ یہ دور بچپن کا دور ہوتا ہے۔ بچپن میں بچہ بے ضرر ہوتا ہے، ہر کسی کے لیے قابل قبول ہوتا ہے، ہر کوئی اس سے محبت کرتا ہے، اس کی ننھی مسکراہٹ پر بے حد خوش ہو جاتا ہے۔ اس دور میں انسان حرارت اور شرارت دونوں سے آزاد ہوتا ہے۔ زندگی کا سفر طے کرتے کرتے ہر بچے کے اندر جوان ہونے کی چاہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ جوانی کا دور ہی ہے جس میں اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنی ہوتی ہے۔ لہٰذا جوانی کے دور میں آتے ہی انسان بچپن کے ارادوں کو عملی جامہ پہناتا ہے، شادی کرتا ہے، بچوں کی پرورش کرتا ہے، ان کی تعلیم و تربیت کرتا

ہے۔گھر چلانے کی خاطر اپنا خون پسینہ بہاتا ہے۔مال وجائداد بنانے کے لیے اپنی جوانی کی ساری قوت صرف کرتا ہے اور اپنی قسمت میں لکھے مقام کو پالیتا ہے۔یہ سورج کی دوپہر والا حرارت بھرا دور ہوتا ہے۔

اس کے بعد انسان کی زندگی میں ایک ایسا دور آتا ہے جو حرارت کا زوال دیکھتا ہے۔یہ انسانی زندگی کا سہ پہر ہوتا ہے۔یعنی ادھیڑ عمری کا دور۔یہاں جوانی کی یادیں چوں کہ تازہ ہوتی ہیں لہٰذا انسان دھوکے میں رہتے ہوئے خود کو جوان ہی سمجھتا ہے۔گزرتے لمحات جب اسے یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ بڑھاپے کی دہلیز پر دستک دے چکا ہے تو خیالات کی انگلی تھامے وہ جوانی کی یادوں کے خزانے کو ٹٹولنے لگتا ہے۔کچھ ہاتھ نہ آتے آتے اس کی قوت سمعی و بصری جواب دے چکی ہوتی ہے۔چلنے کے لیے دو ٹانگوں سے کام نہیں بن پاتا ہے تو ہاتھوں میں ایک لاٹھی آجاتی ہے۔ایام بزرگی میں انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہوتا ہے۔جسمانی قوت ہوتی ہے اور نہ ذہنی صلاحیت میں وہ نکھار ہوتا ہے۔پھر بھی گھر میں اس کی ایک اہمیت ہوتی ہے وہ اس لیے کہ زندگی بھر کا تجربہ اس کے پاس ہوتا ہے۔وہ بڑھاپے کی بانہوں میں جھولتے جھولتے اس تجربے کو اپنے اپنوں کے ساتھ بانٹتا رہتا ہے۔بالکل اُسی طرح جس طرح سورج اپنے مختلف ادوار میں سے گزرتے گزرتے چاند تاروں میں اپنے اجالے کا تجربہ بانٹتا رہتا ہے۔یہاں اس کے عادات واطوار بدل جاتے ہیں۔وہ بچے کی طرح سوچنے لگتا ہے، بچے کی طرح دوسروں کی نگہداشت کا محتاج ہوتا ہے۔بزرگی کا دور انسان کی زندگی کا آخری دور ہوتا ہے۔انجام کار وہ مرجاتا ہے۔مر کے پھر قبر کے اندھیرے میں لیٹ کر ابدی نیند سو جاتا ہے۔یوں ایک تاریکی سے نکل کر زندگی کے مختلف ادوار دیکھ کر پھر سے دوسرے اندھیرے میں جاکر معدوم ہوجاتا ہے۔اس لحاظ سے انسانی زندگی

سورج کی مانند ہے جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اپنے زوال کی طرف خرامے خرامے ڈھلتا رہتا ہے۔

زندگی بھی عجیب شے ہے۔ پہلے ہمیں بچپن کی کلکاریوں کی لالچ دے کر دنیا میں لے آتی ہے۔ پھر جوانی کے خواب دکھا کر ہم سے ہمارا بچپن چھین لیتی ہے۔ ابھی ہم جوانی کے مزے لوٹنے میں مست ہوتے ہیں کہ ادھیڑ عمری دہلیز پر دستک دیتی ہے اور دیکھتے دیکھتے بڑھاپا ہماری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے جو موت کے لیے زندگی کے سارے بند دروازے کھول دیتا ہے۔

......☆☆......

زندگی......!

جو چشم فلک نے دیکھی

جب سے یہ کائنات معرض وجود میں آگئی ہے تب سے چشم فلک نے کیا کیا نہیں دیکھا۔ آدم کی تخلیق دیکھی۔ فرشتوں کی ترتیب دیکھی۔ خدائی دربار میں آدم کی تکریم دیکھی اور ابلیس کی تذلیل دیکھی۔ فرشتوں کو آدم کے سامنے سربسجود دیکھا۔ آدم کو خلد میں داخل ہوتے دیکھا۔ اسی چشم فلک نے اسی آدم کو خلد سے زمین پر اترتے دیکھا۔ آدم زادوں کی قتل وغارت گری دیکھی۔ میکائیل کو مینہ برساتے دیکھا۔ عزرائیل کو انسانوں کی روح قبض کرتے دیکھا اور جبرئیل کو پیغامِ الٰہی زمین پر لاتے دیکھا۔ پیغمبروں کی ایک لامتناہی زنجیر دیکھی اور پھر اس زنجیر کی آخری کڑی کی حیثیت سے حضور پرنور ﷺ کو جلوہ گر دیکھا۔ انسان کی تقدیر کو بدلتے دیکھا۔

پہلے پہلے انسان کو تشنۂ روزی دیکھا۔ زندگی کی گاڑی تھوڑی سی کیا چلنے

لگی کہ اسی انسان کو تشنۂ ترقی دیکھا اور پھر انسان کو ترقی کی بلندیوں میں محوِ پرواز دیکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ انسان سب کچھ حاصل کر چکا ہے لیکن انسانیت کہیں کھو چکا ہے۔ وہ شب و روز مذہب کا نام لیتا ہے لیکن مذہب کے نام پر ایسی خرافات گڑھ لیں کہ ایک سادہ لوح انسان یہ فرق کرنے سے قاصر ہے کہ خدائی قانون کیا ہیں اور انسانی قانون کیا ہیں۔ یہ سارا کچھ چشم فلک کے سائے میں ہوتا رہا کہ جس انسان کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا نہیں تھا وہ آج اپنے پالتو کتّوں کو سنہری لباس پہناتا ہے۔ جس انسان کی ترجیحات پیٹ کی آگ بجھانے اور رفعِ حاجت کے سوا کچھ نہیں تھیں وہ آج قوانینِ فطرت میں دخل اندازی کی جرأت کرنے پر اتر آیا ہے۔ وہ انسان جس کے آبا مٹی کی غاروں میں رہتے تھے وہ آج ستاروں پر اپنا مسکن بنانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔

ہاں چشمِ فلک اس حقیقت کی بھی گواہ ہے کہ جو انسان معمولی سا نزلہ یا زکام برداشت نہ کر کے اپنی جان کھو بیٹھتا تھا وہی انسان آج جانوروں کے اعضاء نکال کر انسانی جسم میں لگا کر انسانی زندگی کو دوام بخشتا ہے۔ چشمِ فلک کے پردۂ بصارت پر یہ بھی محفوظ ہے کہ جو انسان وحشی اور بدصورت وضع قطع کا حامل تھا۔ وہ آج عالم انسانیت کے اندر جمالیاتی حس پیدا کرنے پر اربوں روپے خرچ کرتا ہے...... اور پھر چشمِ فلک نے انسان کی بدلتی تقدیر بھی دیکھ لی۔ ترقی کے منازل طے کرتے کرتے انسان جس تنزلی کی طرف گامزن ہے اُس کا خود انسان کو علم ہے یا نہیں لیکن چشمِ فلک بدستور یہ دیکھ رہی ہے کہ جس انسان کی بھوک معمولی سی گھاس کی پتیوں سے مٹ جاتی تھی آج اُس انسان کی بھوک مٹانے کے لیے سانڈ جیسے بھاری بھرکم جانور بھی کم ہیں۔ جو انسان پتھریلی زمین پر لیٹ کر چین کی نیند سویا کرتا تھا آج وہ انسان مخملی قالینوں پر بچھے کومل بستروں پر رات بھر کروٹیں بدل

بدل کر نیند کو ترستا رہتا ہے جو انسان وحشی اور بدصورت دکھائی دیتا تھا وہ انسان آج تزئین و آرائش کے سارے مراحل سے گزر کر اس قدر قبیح اور وحشتناک لگتا ہے کہ اُس کے اندر بس رہی اُس کی اپنی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔

وہ انسان جو دھول مٹی میں رہ کر خلوص و پیکر کا اعلیٰ نمونہ تھا وہ آج عالیشان حویلیوں میں ایک مکّارانہ زندگی جی رہا ہے۔ وہ انسان جو گھنے جنگلوں میں وحشی جانوروں کے ساتھ بغیر کسی خوف کے زندگی بسر کرتا تھا وہ آج فلک بوس عمارتوں کے شاندار کمروں میں رہ کر ایک معمولی سے مچھر سے ڈرتا ہے۔ وہ انسان جو اپنے کسی بھائی کی ہلکی سی خراش پر خون کے آنسو رویا کرتا تھا وہ آج انسانی لہو میں نہاتا ہے اور انسانی لہو سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ وہ انسان جو مذہب کی پاسداری کے حوالے سے ایک مثال قائم کر چکا تھا وہ آج مذہب کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا غلام بنا چکا ہے۔ وہ دنیا پرست ہے لیکن مذہب کے نام پر۔ وہ خدا بیزار ہے تو مذہب کے نام پر۔ وہ فتنہ پرور ہے تو مذہب کے نام پر۔ وہ قتل انسانیت کو بھی مذہبی فتویٰ دے کر بے دریغ خون بہائے جا رہا ہے۔ وہ انسان جسے پہلے پہل یا تو قدرتی آفات کا ڈر تھا یا پھر وحشی جانوروں کا وہ انسان آج کے ترقی یافتہ دور میں انسان سے تھر تھر کانپ اٹھتا ہے۔

ایسے حالات میں جب انسان پتھر کے زمانے سے نکل کر آج کے برق رفتار سائنسی دور میں پہنچ چکا ہے یہ بات ابھر کر آجاتی ہے کہ کہیں نہ کہیں جا کر اس سفر کو ختم ہونا ہے۔ انسان دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایوریسٹ کو سر کرنے کی خاطر سفر شروع کرتا ہے تو اس کے ذہن میں صرف ہمالیہ کی وہ چوٹی ہوتی ہے جسے وہ سر کرنا چاہتا ہے لیکن یہ بات کبھی اس کے ذہن میں جگہ نہیں پاتی ہے کہ ایک بار جب اس نے وہ چوٹی سر کر لی تو پھر کیا...... اس کے بعد وہ کہاں جائے گا

؟ہاں......اس کے بعد اسے ہر صورت میں بلندی سے واپس اترنا ہے۔ ظاہر ہے کہ بلندی پر پہنچنے کی جو جستجو اس کے دل میں پہلے تھی وہ اب ماند پڑ چکی ہوگی۔ اُس کا وہ احساسِ لذت دم توڑ رہا ہوگا جس کے بل پر وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اتنی بلندی پر پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ یہی حال انسانی زندگی کا بھی ہے۔ انسان جنگلوں سے نکل کر شہروں میں آ گیا۔ غاروں سے نکل کر عالیشان عمارتوں میں زندگی بسر کرنے لگا۔ کچّی گھاس اور کچا گوشت کھانے کے بجائے ہزاروں اقسام کی نعمتوں سے اپنی بھوک مٹانے لگا۔ اب وہ اپنا تن گھاس پتوں سے نہیں بلکہ نہایت ہی بیش قیمتی لباس سے ڈھکتا ہے۔ یوں انسان عروج پر پہنچ چکا ہے لیکن یہاں سے قانونِ فطرت کے عین مطابق اب اسے زوال پذیر ہونا ہے۔ انسان پھر سے وحشی بن جائے گا۔ وہ پھر ننگا پھرتا رہے گا۔ وہ پھر سے کچّی گھاس چبائے گا......فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہ یہ سب کچھ ترقی کے نام پر کرے گا اور ہنسی خوشی کرے گا۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ ایسا سب کچھ سوائے چشم فلک کے کوئی نہیں دیکھ سکے گا کیونکہ انسان کی جو باطنی آنکھ ایسا سب کچھ دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی اُس کی بینائی کھوکھلی ترقی کی شاہراؤں پر رقصاں خوشی اور مسرتوں کی بھول بھلیّوں میں کہیں کھو چکی ہوگی۔

......☆☆......

زندگی......!

نچوڑ

اس کتاب میں شامل مضامین کا نچوڑ کچھ یوں نکالا جاسکتا ہے:
زندگی ایک حسرت ہے۔کسی کی پوری ہو جاتی ہے تو کسی کی رہ جاتی ہے۔ زندگی خوشی کا نام ہے جو ایک پل آتی ہے تو دوسرے پل جاتی ہے۔زندگی برف کی مانند ہے جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پگھل کر پانی بن کر بہہ جاتی ہے۔زندگی ایک کہانی کی مانند ہے، کہانی کے الفاظ اچھے تو کہانی اچھی ، اسی طرح زندگی کے اوصاف اچھے تو زندگی اچھی۔زندگی ہمت کا نام ہے جو قریب آتی ناکامیوں کو فتح و نصرت میں بدل دیتی ہے۔زندگی مسکرانے کا نام ہے۔ زندگی بڑی ہی عجیب چیز ہے۔ کچھ جیتے جی مر جاتے ہیں اور کچھ مر کے جی لیتے ہیں۔زندگی انسان دوستی کا نام ہے۔زندگی ایک خیال ہے ۔ خیال اچھا تو زندگی اچھی اور خیالات بدلتے رہتے ہیں۔زندگی کامیابی اور ناکامی کا محلول ہے جو ہر کسی کو پینا پڑتا ہے۔زندگی

ایک پھول ہے جس کا رنگ اور جس کی مہک انسانی ذہن کو ایک لطیف احساس سے سرشار کر دیتے ہیں۔ زندگی اُس کامیابی کا نام ہے جو ہم اپنے نفس پا قابو پا کے حاصل کرتے ہیں۔ زندگی تجربات کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ زندگی وہ شمع ہے جسے طوفانوں نے گھیر رکھا ہے اور اسے ہر صورت میں روشن رکھنا پڑتا ہے۔ زندگی تکمیل انسانیت کا نام ہے نہ کہ عیش کوشی کا۔ زندگی دکھوں کے موتیوں سے چنی ہوئی ایک حسین مالا ہے جو ہر کسی کے گلے میں ڈال دی جاتی ہے۔ زندگی ایک مقدس فریضہ ہے جس کی انجام دہی سے کوئی منہ نہیں موڑ سکتا۔ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر چڑھنے کی کوشش میں ہر انسان پہلے پہل ڈگمگا جاتا ہے۔ زندگی موت سے بغاوت کا نام ہے۔ زندگی توقعات کی کڑیوں کی ایک زنجیر ہے۔ زندگی تلاش ہے خوابوں کے تعبیروں کی، امیدوں کی، امنگوں کی، آرزوؤں کی۔ زندگی ایک خاموشی ہے جو ایسا ہنگامہ بپا کر دیتی ہے کہ انسان سکون کو ترستا ہے۔ زندگی ایک دوڑ ہے جس میں دوڑنے سے معذور انسان بھی حصہ لیتا ہے۔ زندگی اندازِ فکر کا نام ہے نہ کہ برسہا برس جینے کا، جس کی فکر جوان وہ بزرگی کے دور میں بھی پُر شباب رہتا ہے۔ زندگی ایک امید ہے جس کو تھام کر ہی ہم آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ زندگی افسوس بھی ہے۔ زندگی ایک ویرانہ ہے اگر محبت سے خالی ہے۔ زندگی ایک کھیل ہے جو بے سبب نہیں کھیلا جاتا۔ زندگی ایک انوکھی اڑان ہے جس میں انسان کے پیر زمین پر ہوتے ہیں لیکن خیالات آسمان کی بلندیوں میں محوِ پرواز ہوتے ہیں۔ زندگی ایک درد ہے، ایک کرب ہے۔ زندگی تنہائی کا نام ہے۔ زندگی ایک کتاب ہے جس کا ایک ایک ورق ایک داستان لیے ہوئے ہے۔ زندگی خواب کی طرح خوبصورت اور ایک حادثے کی طرح بھیانک ہوتی ہے۔ زندگی موت کی ضد ہے۔ زندگی پیدائش اور موت کے درمیان کا وقفہ ہے۔ زندگی ایک پہیلی ہے جس نے بوجھی

کامیابی پائی اور جو نہیں بوجھ سکا وہ الجھ کر رہ جاتا ہے۔زندگی ایک سلجھاؤ ہے اگر خیالات سلجھے ہیں تو۔زندگی ایک ٹھہراؤ ہے اگر استقامت کا جذبہ ہے تو۔زندگی ایک حُسن ہے جس کی جمالیاتی حس کے ذریعے داد دی جاتی ہے۔زندگی عروج و زوال کی ایک لمبی داستان ہے۔زندگی معجزہ ہے۔زندگی قدرت کی صناکاریوں کا اعجاز ہے۔زندگی ایک تڑپ ہے لیکن پھر بھی کئی لوگ کبھی تڑپتے نہیں۔جو تڑپتے ہیں وہی پنپتے ہیں۔زندگی ایک دعا ہے قبول ہوگئی تو ثواب ہے رد ہوگئی تو عذاب ہے۔زندگی ایک نعمت ہے جس کا لطف صرف قدرداں ہی اٹھاتے ہیں۔زندگی کشمکش کا نام ہے۔زندگی ایک ہنگامہ ہے۔زندگی ایک نغمہ ہے جسے حسرت کی دھن پہ گایا جاتا ہے۔زندگی ایک احساس ہے جو انسان کو مروّت بخشتا ہے۔زندگی اُس سکون کا نام ہے جو مصیبتوں سے چھین لیا جاتا ہے۔زندگی اُس خوشی کا نام ہے جو غم کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔زندگی اُس پُر مسرت پل کا نام ہے جو درد کی گرفت سے چھوٹ کر ہماری جھولی میں گر جاتا ہے۔زندگی وہ خواہش ہے جو برف کے گرتے گالوں پر لکھی جائے اور زمین پر پہنچتے پہنچتے پانی کا بلبلا ثابت ہوجاتی ہے۔زندگی وہ خوش فہمی ہے جسے موت خاک میں ملا دیتی ہے۔زندگی موت کا بچپن ہے۔زندگی محبت کا وہ کچّا دھاگا ہے جو انسانیت کے نازک رشتے کو کس کے باندھ لیتا ہے۔زندگی ایک راز ہے جو اس وقت کھُل جاتا ہے جب موت دبوچ لیتی ہے۔زندگی ایک امتحان گاہ ہے جس کے اندر کئی امتحانات دینے پڑتے ہیں۔زندگی ایک معرکہ ہے جو جسمانی قوت سے نہیں بلکہ شعور کے بل پر سر کیا جاتا ہے۔زندگی ایک خواب ہے جو انسان کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر اس کی تعبیر بند آنکھوں میں پاتا ہے......زندگی ایک راز ہے جو جتنا چھُپا رہے اتنا اچھا ہے۔زندگی ایک دریا ہے جو کبھی ایک ہی سمت میں نہیں چلتا ہے بلکہ موڑ بدلتا رہتا ہے اور ہر بدلتے موڑ پر اپنا

بہاؤ اور گہرائی دونوں بدل دیتا ہے۔ زندگی ایک طوفان ہے جسے جھیلنا ایک فن ہے۔ زندگی ایک سایہ ہے جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ زندگی ایک درد ہے جسے ہم خوشی خوشی سہہ لیتے ہیں۔ زندگی ایک زہر ہے جسے ہم امرت سمجھ کر پی لیتے ہیں۔ زندگی ایک سزا ہے جسے ہم انعام سمجھ کر گلے لگا لیتے ہیں۔ زندگی ایک ایسا دوست ہے جو کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا ہے۔

زندگی دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے جس میں دھوپ جیت جاتی ہے اور نہ چھاؤں ہار جاتی ہے۔ زندگی شہزادوں کی سہل انگاری ہے۔ زندگی غلاموں کی مجبوری ہے۔ زندگی محنت کشوں کی عرق ریزی ہے۔ زندگی بادشاہوں کی عیش کوشی ہے۔ زندگی کا ہر گزرتا لمحہ ایک ایسا معجزہ ہے جو پلٹ کر نہیں آسکتا۔ زندگی اُتار بھی ہے چڑھاؤ بھی۔ زندگی مسکراہٹوں کا نغمہ ہے جو غموں کی لے پر گایا جاتا ہے۔ زندگی آسمان ہے جو زمین کا ماتھا چومنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ زندگی راحت کا پنگوڑا ہے جو کلفتوں کے ستونوں کے ساتھ لٹکتا رہتا ہے۔ زندگی وہ سنہری دھوپ ہے جو آلام و مصائب کی گھنی شاخوں کو چیر کر ہمیں سہلاتی ہے۔ زندگی وہ پُر نور صبح ہے جو ظلمتِ شب کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ زندگی سُکھ کی وہ سانس ہے جو دکھ کے ریگزاروں کو پاٹ کر ہمارے ساتھ دامن گیر ہو جاتی ہے۔ زندگی اُن خوابوں کا نام ہے جو مشقت کے سنگلاخ راستوں پر ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ زندگی مظلوم کی وہ آہ ہے جو آسمانوں کا سینہ چیر کر خدائی دربار میں فریاد بن کر پہنچ جاتی ہے۔ زندگی ماں کی وہ دعا ہے جو آسمان کی رفعتوں تک جانے والے مشکل راستوں کو آسان بنا دیتی ہے۔ زندگی ظالم کی وہ جفا ہے جو مظلوم کی آنکھوں میں پنپتے خوابوں کی تعبیر کو مسل دیتی ہے۔ زندگی اپنائیت کا وہ لطیف احساس ہے جو اجنبیت کے طوفان سے لڑکر ہماری دکھتی رگوں کو سہلاتا ہے۔ زندگی انہی بے شمار حقیقتوں کے حلقوں

سے بنی وہ زنجیر ہے جو تب تک ہمارے گلے پڑے رہتی ہے جب تک موت نہ آجائے۔

یہاں پر میں علامہ اقبال کی نظم ''زندگی'' اس مضمون کے اختتامیہ کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ موضوع کے اعتبار سے اس سے بہتر اختتامیہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

بر تر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز وفردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

......☆☆......

زندگی......!

خوبصورت بھی ہے

یہ اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔ترتیب کے لحاظ سے اس مضمون کو کتاب کے ابتدائی حصے میں شامل رکھنا مناسب تھا لیکن میں نے اس مضمون کو کتاب کے اختتامیہ کے طور شامل کرنا اس سے کہیں زیادہ مناسب سمجھا۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔اب تک کے مضامین میں زندگی کے کئی روپ سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر روپ ایسے ہیں جو انسان کو رنج وغم یا پریشانیوں سے دوچار کردیتے ہیں۔مثلاً ناکامی،خوف،موت،جدو جہد،محنتِ شاقہ، کشمکش،غم ، حسد، دشمنی،قتل وغارت گری، جنگ وجدل،آنسو،ماتم،چیزوں کا تضاد،خوف خدا،مذہب کی پاسداری،مختلف قسم کی ذمہ داریاں،امتحان و آزمائش،قسمت اور تقدیر کی جنگ،حادثات،رسم ورواج کی لٹکتی تلوار، دھوکہ،خودغرضی،یاس وناامیدی، بنا تعبیر کے خواب،کھلی آنکھوں کے سپنے،ظلم و جبر کے وار،تعلیم وتربیت کی اخلاقی

ذمہ داریاں یا پھر زندگی جینے کے راستوں کی کھوج ایسے مسائل ہیں جو ہمہ وقت ہمارے احساسات و جذبات کو برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ایسے میں زندگی جی لینے کی آزمائش میں کھرا اترنا اور پھر مسکراتے بھی رہنا کافی مشکل دکھائی دیتا ہے۔پھر بھی یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس کے باوجود ہم زندگی کو ہنسی خوشی جینے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔واقعی زندگی غموں اور پریشانیوں سے بھری پڑی ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم جینا چھوڑ دیں۔ہمیں جینا ہے اور ہم جی لیں گے اس بات کو نظرانداز کر کے کہ زندگی جی لینا زہر پینے کے برابر ہے۔

یہاں میں نے موضوع چنا ہے ''زندگی خوبصورت بھی ہے۔'' جینے کے لیے لازمی ہے کہ ہم اس بات کو بھول جائیں کہ زندگی کوئی چیلنج ہے بلکہ ہم یہ یقین کر لیں کہ زندگی بہت ہی خوبصورت ہے۔ذہن میں یہ بات بٹھاتے ہی زندگی زرنگار بن جاتی ہے اور جینے میں لطف آجاتا ہے۔اب بات یہ ہے کہ زندگی کس زاویے سے خوبصورت ہے۔اگر زندگی جی لینا انگاروں پر چلنے کے مترادف ہے تو پھر یہ کیسے خوبصورت ہو سکتی ہے۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ زندگی واقعی بہت ہی خوبصورت ہے۔

سارا کچھ ہماری سوچ پر منحصر ہے۔سوچ مثبت ہے تو ہر چیز خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔منفی سوچ رکھنے والوں کو تو گلاب نظر نہیں آتے ہیں بلکہ نوکیلے کانٹے نظر آتے ہیں۔اسی طرح زندگی کے تئیں بھی ہماری سوچ مثبت رہنی چاہیے۔اُسی صورت میں ہمیں یقین آئے گا کہ زندگی جب تک ہے تب تک خوبصورت ہی ہے۔اگر ایک مرے ہوئے شخص کو دوبارہ زندگی عنایت کی جائے تو وہی بتا سکتا ہے کہ زندگی کس قدر پُرکشش ہے۔مرنے کے بعد اس نے بخوبی جان لیا ہوگا کہ موت نے اسے کس بیش بہا نعمت سے محروم کر دیا تھا۔انسان زندہ ہے تو ہر رنگ

رنگین ہے۔زندگی ہے تبھی اجالا ہے،زندگی ہے تو نور ہے،زندگی ہے تو پرواز ہے، زندگی ہے تو منزلیں ہیں،زندگی ہے تو محبت کی چاشنی ہے،زندگی ہے تو اپنوں کا اپنا پن ہے،زندگی ہے تو ماں کی ممتا ہے اور باپ کا پیار ہے،زندگی ہے تو دوستی کے بندھن ہیں،زندگی ہے تو سورج کی کرنیں سنہری ہیں،زندگی ہے تو مسکراتی چاندنی ہے،زندگی ہے تو ستاروں کی جگمگاہٹ ہے،زندگی ہے تو نیلگوں آسمان کا سایہ ہے، زندگی ہے تو گلوں کی مہک ہے،زندگی ہے تو بلبلوں کی چہک ہے،زندگی ہے تو مورنیوں کا ناچ ہے،زندگی ہے تو جھرنوں کا راگ ہے،زندگی ہے تو آبشاروں کے نغمے ہیں،زندگی ہے تو پیار ومحبت کی کہانیاں ہیں، زندگی ہے تو بچوں کی کلکاریاں ہیں،زندگی ہے تو شبنم کے موتی ہیں،زندگی ہے تو قوس قزح کے رنگ ہیں،زندگی ہے تو باد صبا کے جھونکے ہیں،زندگی ہے تو دل فریب مناظر ہیں،زندگی ہے تو کوہ و دمن ہیں،زندگی ہے تو باغ و بہار ہیں،زندگی ہے تو ارادے ہیں،زندگی ہے تو خواب ہیں،زندگی ہے تو بے پناہ خواہشوں کے قافلے ہیں،زندگی ہے تو امید کے دیپ جلتے ہیں،زندگی ہے تو خوشی کو معنی ملتا ہے،زندگی ہے تو دل کا سکون ہے، زندگی ہے تو آسمان چھونے کا جنون ہے،زندگی ہے تو کیا نہیں ہے۔ جب یہ سب کچھ ہے تو کیا زندگی خوبصورت نہیں ہے؟

زندگی بے شک خوبصورت ہے۔پوری کائنات میں ہم جدھر بھی دیکھیں گے زندگی کا حسن پھیلا ہوا نظر آئے گا۔زندگی کا یہ حسن ایک عظیم نعمت ہے۔جس دم ہم زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات میں جتنی بھی نعمتیں ہیں ہم ان کے حقدار نہیں رہتے ہیں۔جبکہ جیتے جی یہ نعمتیں ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔بہت ہی بد نصیب ہیں وہ لوگ جو زندگی میں چند ایک آزمائشیں دیکھ کر زندگی کو کوسنے لگتے ہیں۔قابل رحم ہیں وہ لوگ جو ذرا سی تکلیف دیکھ کر

زندگی کو خوبصورت ماننے سے انکار کرتے ہیں اور پھر اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ موت کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگوں کے ہاں ادراک کی کمی ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ زندگی کا وہ روپ دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں جسے خوبصورتی کا نام دیا جاتا ہے۔

زندگی خوبصورت نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ زندگی جیتے جیتے جو لطف ہم اٹھاتے ہیں اس کی اجازت تو عالمی مذاہب بھی برملا طور پر دیتے ہیں۔ انسان کو روئے زمین پر بسا کر اس کی خاطر جن نعمتوں کا بندبست قدرت نے کیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ زندگی کو شاہانہ طور پر جینا ہے۔ زمین، آسمان، کوہسار، جھیل جھرنے، نالے، دریا سمندر، بہتے چشمے، رنگا رنگ چرند و پرند، جنگل و بیاباں، شمس و قمر، کہکشاں، وسیع و عریض کائنات وغیرہ یہی چیزیں تو زندگی کو خوبصورت بنا دیتی ہیں۔ یہ ساری چیزیں قدرت کے حکم کے عین مطابق وجود میں لائیں گئیں پھر انسان کو زمین پر اتارا گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ زندگی کوئی سزا نہیں ہے جسے انسان جیسے تیسے پورا کر کے سپرد خاک ہو جائے بلکہ زندگی ایک سنہری موقع ہے جو ماں کی کوکھ سے جنمے ہر بچے کو دیا جاتا ہے۔ کسی چیز کا موقع ملے تو دانائی یہی ہے کہ اس گنوانہ دیا جائے بلکہ خوشی خوشی اسے قبول کرنا چاہیے۔

سکندر اعظم کو موت کی بھنک لگی تو وہ بہت پچھتایا کہ وہ زندگی جیسے حسین تحفے سے محروم ہونے والا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ زندگی کا لطف وہ مزید نہیں اٹھا سکتا اور اس کی خوبصورتی سے محظوظ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ مرنے والے سکندر کو ہی معلوم تھا کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ اپنی زندگی میں تاج محل تعمیر کراتے کراتے شاہجہاں نے جو خوبصورت لمحات جی لیے اس کا خلاصہ صرف وہی کر سکتا ہے۔ مگر جو زندگی کی خوبصورتی اس سے چھین لی گئی اس کا کچھ بھی صرف وہی بیان کر سکتا

ہے۔اسی طرح دنیا کی نامور ہستیاں جنہوں نے تاریخ بناڈالی وہی بتا سکتے ہیں کہ زندگی کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔

انسان زندگی میں خواب سجاتا ہے۔پھر ان خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے میں لگ جاتا ہے۔اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے میں جو لذت وہ محسوس کرتا ہے وہی چیز اس کی زندگی کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ماں کی اندھیری کوکھ سے جنم لے کر قبر کے ایک اور اندھیرے تک کا وقفہ انسان کو تحفے میں دیا جاتا ہے۔اس وقفے میں انسان مختلف ادوار میں سے گزر کر زندگی کی خوبصورتی کو بالکل اسی طرح چوس لیتا ہے جس طرح شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس لیتی ہے۔بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی اور پھر جوانی سے بزرگی زندگی کے یہ مختلف دور بھی زندگی کی خوبصورتی ہی تو ہے۔کیا زندگی اس بچے کے لیے خوبصورت نہیں جو ماں کی گود میں بے نیاز ہو کر شیر مادر کے جام پیتا ہے؟ کیا زندگی اُس نوجوان کے لیے خوبصورت نہیں ہے جس کی جوانی کو سجانے سنوارنے اور ایک خاص سانچے میں ڈالنے کے لیے اُس کے والدین اپنے خواب بیچتے ہیں؟ کیا زندگی ان والدین کے لیے بھی خوبصورت نہیں ہے جن کی نظروں کے سامنے ان کے جوان گبر آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں؟ ہاں، زندگی ان بزرگوں کے لیے بھی خوبصورت ہے جو پہلے اپنے بچوں اور پھر اپنے پوتے پوتیوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتے دیکھتے ہیں۔زندگی ماں کے لیے بھی خوبصورت ہے جو بچوں کی پرورش کرنے میں ایک مسحور کن لذت محسوس کرتی ہے۔

بات واضح ہو چکی ہے کہ جس زاویے سے بھی دیکھیں، زندگی خوبصورت ہی ہے۔ہاں کوئی شخص اگر زندگی کو مایوسی کی عینک سے دیکھتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے کہ اسے زندگی کچھ اور ہی چیز لگتی ہے۔اجلی دوپہر کو اگر کوئی شخص اپنی

آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لے کہ ہر طرف اندھیرا ہے تو وہ خود ہی گھاٹے میں ہے۔زندگی جی لینے والے زندہ دل لوگ تو اجلی دوپہر کا فائدہ اٹھا کر ہی رہیں گے۔اُن کی سوچ پر آنکھیں بند کرنے والے شخص کا ذرہ برابر بھی فرق پڑنے والا نہیں ۔زندگی اتنی بے مزہ نہیں جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔زندگی بہت ہی رنگین ہے۔لہٰذا اسے جی بھر کے مسکراتے جی لینا ہی دانشمندی ہے۔

......☆☆......

تاثرات

تاریخ

تاثرات

تاریخ

تاثرات

تاریخ

WARQ WARQ ZINDAGI



نام: صابر حسین وانی

قلمی نام: ایثار کشمیری

تعلیم: ایم اے (انگریزی) ایم۔ایڈ

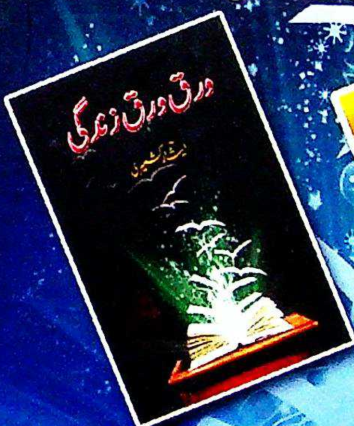
پیشہ: سرکاری استاد

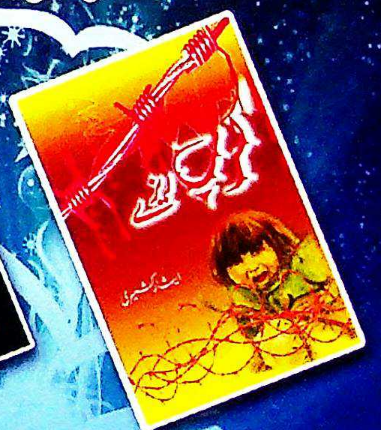
سکونت: ترال پلوامہ کشمیر

پن: ۱۹۲۱۲۳

ای میل: isaarkashmiri@gmail.com

مصنف کی شائع شدہ کتابیں





ورق ورق زندگی
مضامین (۲۰۱۹)

کرب ریزے
افسانے (۲۰۱۳)

مصنف کی آنے والی کتابیں

- آشیاں سے قفس تک (افسانے)
- میں اور میری آوارگی (انشائیے)
- انگریزی ناول (Hamza)

creativestar PUBLICATIONS
Jamia Nagar, New Delhi-110025
+91 9958380431 +91 8851148278

ISBN: 9789387884519